Regd. L. No. 7243
Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1971

بتقریب یومِ پاکستان

قائدِ اعظمؒ کا ارشاد

(حیدرآباد۔ دکن میں)

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور ۹

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستان سالانہ دس روپے	۸۰۸۰۰	ایک روپیہ
غیر ممالک سالانہ ایک پونڈ	خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور	
نمبر (۳)	مارچ ۱۹۷۱ء	جلد (۲۴)

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز ——— ۱۱

۳۔ "مفکرِ اسلامؒ اور ماہرِ تعلیم ——— (شاہد عادل) ——— ۱۸

۴۔ مذاکرہ ——— (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۰ء) ——— ۲۰

۵۔ اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید اور عربی زبان ——— (محترم رفیع اللہ صاحب) ——— ۶۹

۶۔ حقائق و عبر ——— (باہمی رُتب قلب ٹ) ——— (قرآن کریم سے واقفیت) ——— ۷۴
(ایک ذہنیت) ——— (دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں) ———

۷۔ طلوعِ اسلام کا پنج نقسط ——— ۷۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵۔بی گلبرگ، لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

جس وقت قارئین کے ہاتھوں تک یہ پرچہ پہنچے گا، مجلسِ آئین ساز کے منتخب ارکان، ڈھاکہ میں اپنی نشستوں کی ترتیب میں معروف ہوں گے تاکہ ملک کے لئے ایک جدید آئین مرتب کیا جا سکے۔ مملکت کی تقدیر اس کے آئین کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے اُس مقصدِ عظیم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کے حصول کے لئے اس مجلس کا یہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ یہ مملکت اپنے یومِ تاسیس سے اس وقت تک بے آئین چلی آ رہی ہے۔ اس اعتبار سے آئین سازی کے لئے یہ اقدام مملکت کے ہر بہی خواہ کے لئے وجہ صد اطمینان اور باعثِ ہزار مسرت ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن حالات کی دگرگونی (اور یوں کہیئے کہ ہماری بدنصیبی) ملاحظہ ہو کہ اس تقریب پر ہر بہی خواہ مملکت کا دل سینے میں دھڑک رہا ہے اور لب پر اس کی سلامتی اور خیر طلبی کی دعائیں آ رہی ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہے اس غیر مقید جمہوریت کا جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید کی رُو سے اپنا سیاسی مسلک قرار دیا، جس کے حصول یا بحالی کے لئے ہم نے وہ ادھم مچایا کہ اس سے اٹھا ہوا غبار آج تک ملک کی فضاؤں کو گرد آلود کئے ہوئے ہے، جسے ہمارے "مقدسین" نے عین مطابقِ اسلام قرار دیا اور جس کے حصول پر مسرت کے شادیانے بجائے گئے۔ حالانکہ ہم مسلسل پکارتے رہے کہ نہ یہ (مغربی) جمہوریت اسلامی ہے اور نہ ہی (بہ حالاتِ موجودہ) ہمارے حالات کے سازگار۔ اس جمہوریت کا غلغلہ غیر منقسم ہندوستان میں، ہندوؤں نے بلند کیا تو ہم نے، طلوعِ اسلام کی اُس دور کی اشاعتوں میں، اس کی سخت مخالفت کی۔ اس کے بعد یہاں آنے پر بھی ہم اس موضوع پر پیہم اور متواتر لکھتے رہے کہ اس جمہوریت کا اسلامی ہونا تو درکنار، خود اہلِ مغرب بھی اپنے ہاں کے ناکام تجارب کے بعد اسے ہزار خرابیوں کا موجب قرار دے رہے ہیں۔ مغربی جمہوریت

کی بنیادی خصوصیت، جس کی وجہ سے اسے موجب ہزار خیر و برکت قرار دیا جاتا ہے، یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں لوگ اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی حاکم ہوتا ہے نہ محکوم۔ اس طرح لوگوں کو مکمل آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن مغربی مفکرین اور سیاسین اب چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ مفروضہ سراسر غلط اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ (RENE GUENN) کے الفاظ میں:-

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔ جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی ..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے حاکم آپ ہیں ..... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(THE CRISIS OF THE MODERN WORLD)

جمہوری نظام کا بنیادی مسلمہ یہ ہے کہ اکثریت کو حقِ حکومت حاصل ہے۔ اس باب میں "تشکیلِ انسانیت" کا مصنف برملا لکھتا ہے کہ

> ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، استبداد ہے طاقت ور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت، عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے ..... یہ انکشاف آج کا نہیں، بہت قدیمی ہے کہ اقتدارِ مطلق بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو... نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت، کسی رنگ میں ہو، اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی۔ دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی۔ دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی

پادری کی ہو یا برہمن کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ، اور اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے ...... ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اسی حقیقت کو ایک فقرہ میں یوں سمٹا دیا تھا کہ

> دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر، دھمکا کر، اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی - جلد دوم)

مذہب کے جمہوری نظام کا دوسرا بنیادی مسلمہ یہ ہے کہ اکثریت جو کچھ کہے اسے بطور حق کے تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی اس میں غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اکثریت کے ہر فیصلہ کو صحیح اور حق قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ

> یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ (محض ان کے ایسا کہنے کی بنا پر) صحیح نہیں ہو سکتی .... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں (جب حقیقت یہ ہے تو پھر) یوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی طور پر صحیح ہے وہی صحیح ہے
>
> (THE CRISIS OF CIVILISATION)

ہم نے کہا تھا کہ "غیر مقید جمہوریت" تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے۔ غیر مقید جمہوریت سے ہماری مراد ایسا نظام ہے جس میں اکثریت کے ہر فیصلہ کو صحیح اور واجب التسلیم قرار دیا جائے۔ یعنی اس کے صحیح اور مبنی برحق ہونے کی دلیل یہ ہو کہ اکثریت ایسا کہتی ہے۔ اس میں اور ڈکٹیٹر شپ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ڈکٹیٹر اپنے ہر فیصلہ کو دوسروں سے منواتا ہے اور وہ ایسا اُس قوت کے بل بوتے پر کراتا ہے جسے اس نے کسی طرح فراہم کر لیا ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی کچھ اکثریت (MAJORITY) پارٹی کا لیڈر کرتا ہے، اور اس کے پیچھے کثرتِ رائے کی وہ قوت ہوتی ہے جسے اس نے انتخابات کے ذریعے فراہم کر لیا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مقید جمہوریت (CONTROLLED DEMOCRACY) ہے جس میں کچھ غیر متبدل اصول و ضوابط ہوتے ہیں جن کے خلاف کسی کا فیصلہ صحیح نہیں سمجھا جاتا، خواہ اسے کتنی ہی اکثریت کیوں نہ حاصل ہو۔ اسلام اس قسم کی جمہوریت کا قائل ہے جسے وہ شورائیت کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی اس نظام میں، ایک غیر متبدل چار دیواری ہوتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے قوم اپنے معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتی ہے، اور کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ان حدود سے تجاوز کر سکے۔ ہماری نئی نسل (جسے ہماری مذہبی پیشوائیت نے مذہب گزیدہ بنا دیا ہے) ہر اس تصور کو

رجعت پسندانہ قرار دے دیتی ہے جسے "مذہب" کے نام سے پیش کیا جائے۔ اس لئے ہم ان کے اطمینان کے لئے، مذکورہ بالا تصورِ جمہوریت کی تائید میں ایک مغربی مفکر کا قول پیش کرتے ہیں۔ ہماری مراد اٹلی کے مشہور مدبر میزینی سے ہے۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جہاں وحدتِ عقاید نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو یا زیادہ، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت بھی قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا..... یاد رکھیئے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے، تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

یہ ہے وہ نظامِ جمہوریت، جسے اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی وہ نظامِ شورائیت جس میں غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و اقدار ہوں اور امت کا فریضہ ان اصول و اقدار کی جزئیات متعین کر کے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق انہیں نافذ کرنا ہو۔ یہی وہ جمہوریت تھی جسے نافذ کرنے کے لئے اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا تھا اور قائداعظمؒ نے اسے حاصل کر کے قوم کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر کے، مغرب کی غیر مقید جمہوریت کو اپنا نصب العین قرار دے لیا۔ جب ہم نے خود ہی ایسا کیا ہے تو پھر اس کے نتائج بھی بھگتنے پڑیں گے خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ اسی نظامِ جمہوریت کی رُو سے عوامی لیگ نے اکثریت حاصل کر لی ہے اور اس کے لیڈر کو آئین مرتب کرنے اور اس کے بعد حکومت قائم کرنے کے اختیارات مل گئے ہیں۔

لیکن یہ اختیارات مل جانے اور ان کے استعمال کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، اور یہی وہ فرق ہے جس سے ایک حکومت اور دوسری حکومت میں تمیز کی جاتی ہے۔ ڈکٹیٹر اپنے اختیارات کا استعمال اپنی اور اپنے گروہ کی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ اسے اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے کسی فیصلے کے برحق یا جائز ہونے کے متعلق دلائل و براہین پیش کرے۔ اور اس طرح لوگوں کو مطمئن کرکے اور اپنا ہمنوا بنا کر اس فیصلے کو نافذ کرے۔ وہ ایک فیصلہ کرتا ہے اور اسے قوت کے بل بوتے پر منواتا ہے۔ اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے متعلق عوام کا ردِ عمل کیا ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا اندازِ حکومت وہ ہوتا ہے جس میں اربابِ اختیار اپنے فیصلوں کی علت و غایت کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے محاسن و نقائص کو سامنے لاکر، عوام کو مطمئن کرتے ہیں کہ نقائص کے مقابلہ میں ان کے محاسن زیادہ ہیں۔ ان پر جو تنقید ہوتی ہے، اسے کشادہ نگہی سے دیکھتے اور خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ امر موجبِ صد تاسف ہے کہ عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمن نے، اپنے اختیارات کے استعمال میں جو طریق اختیار کیا وہ آمرانہ ہے، ہم نوایانہ نہیں۔ وہ نہایت تحکمانہ انداز میں کہتے ہیں — اور بار بار کہتے ہیں — کہ ہم اپنے "چھ نکات" کی بنیادوں پر آئین بنائیں گے اور اس میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔ یا انہیں مانو ورنہ جو جی میں آئے کرلو۔ ظاہر ہے کہ ایک عوامی حکومت کا یہ انداز کبھی نہیں ہوتا — اب سوال یہ ہے کہ اگر آئین وہی ملک پر مسلط کیا جاتا ہے جسے عوامی لیگ نے اپنے چھ نکات کی بنیادوں پر مرتب کرنا ہے (بلکہ مرتب کرلیا ہے) تو پھر مجلسِ آئین ساز کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اس کا اجلاس طلب کرنے کا تکلف کس لئے؟ "چھ نکات" کا تعلق مملکت کے جزئی یا فرعی امور سے نہیں۔ اس کی اصل بنیاد دسے ہے۔ ان کی رُو سے پاکستان کی سالمیت اور استحکام باقی نہیں رہتے۔ یہ خود اس مملکت کے وجود کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ ملک کا جو طبقہ ان نکات سے متفق نہیں وہ ان خطرات کی نشان دہی کر رہا ہے لیکن عوامی لیگ نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے کہ ان مخالفین کے خدشات کا ازالہ کیا جائے نہ اس کی حاجت کہ ان نکات میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش رکھی جائے۔ وہ اپنی اس ضد پر قائم ہے کہ آئین انہی نکات کے مطابق بنے گا اور اس کی "دلیل" وہ قوت ہے جو اسے عددی اکثریت کی بنا پر حاصل ہوگئی ہے۔ یہ ہے غیر مقید جمہوریت کے شجرۂ الزقوم کا وہ پہلا پھل جس سے قوم بہرہ یاب ہو رہی ہے۔

میزینی نے کہا ہے کہ جس قوم میں وحدتِ عقاید نہ ہو اس میں جمہوریت صرف اکثریت کے مفاد کی محافظ ہوتی ہے اور اقلیت کو بہرحال مغلوب رہنا پڑتا ہے۔ قرآنِ مجید نے وحدتِ عقاید کو قومیت کی تشکیل کی بنیاد قرار دیا تھا، اور اسی معیارِ قومیت کی رُو سے ہم نے پاکستان کا مطالبہ اور اسے حاصل کیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم میں وہ وحدتِ عقاید موجود ہے جس سے ہم نے ایک قوم بننا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم تئیس سال تک یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دیتے رہے کہ اسلام وہ رشتہ ہے جس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے خطوں میں اس قدر

بُعدِ مسافت' اور مغربی پاکستان میں' رنگ ونسل وزبان کے اس قدر اختلافات کے باوجود ہمیں امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے' لیکن یہ صرف فریب تھا۔ ہم میں نہ وہ اسلام تھا جو اس قدر اختلافات کے باوجود انسانوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے' اور نہ ہی ہم امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھلے تھے۔ حکمران طبقہ کو تو چھوڑیئے' دیکھئے یہ کہ جو مقدسین" اقامتِ دین کے دعوے دار (بلکہ واحد اجارہ دار) بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے' اسلام کی بنیادوں پر مسلمانانِ پاکستان کو ایک امت کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے کیا کیا؟ انہوں نے یا تو اپنی جماعت کی علیحدہ تنظیم کی' اور یا اسلام کا نام لے کر' برسراقتدار طبقہ کی اس لئے مخالفت کی کہ اقتدار ان کے حوالے کیوں نہیں کیا جاتا۔ ان کا سب سے بڑا حربہ عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت تھی۔ اور اس سے مقصود صدر ایوب کو بدنام کرنا تھا اور بس۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ صدر ایوب کی معزولی کے بعد اب ان حضرات کو نہ عائلی قوانین کی اسلام سوزیاں دکھائی دیتی ہیں' نہ خاندانی منصوبہ بندی کی کفر نوازیاں۔ ہمارا مروجہ اسلام قومیت سازی میں کس حد تک مؤثر عنصر بن چکا ہے' اس کا اندازہ ہمارے نوجوان طبقہ کے سینے میں ان موجزن جذبات سے لگایا جا سکتا ہے جو کبھی کبھی بے ساختہ ان کی زبان یا قلم پر آجاتے ہیں۔ ڈھاکہ سے شائع ہونے والا ہفتہ وار (FORUM) اپنی ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

> ۷ دسمبر تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجۂ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس ملمع کی قلعی کھول دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نظریۂ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوش نمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پرور طبقہ' اس شدومد سے پیش کیا کرتا تھا' افسانہ بن کر رہ گئیں۔

اسلام تو خیر بہت دور کی چیز تھی' یہاں تو مغرب کے اندازِ سیکولرازم کے مطابق' وطن کی بنیادوں پر بھی ہم ایک قوم نہ بن سکے۔ کیا ایک قوم میں' بنگلہ دیش اور غیر بنگلہ دیش کی باتیں بھی ہوا کرتی ہیں۔ کیا اس میں' بلوچی' سندھی' پنجابی' پٹھان کی تمیز وتخصیص بھی ہوا کرتی ہے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ ان امتیازات واختصاصات کو ختم کرنے کے لئے کچھ نہ کیا بلکہ تئیس سال تک مسلسل ایسے اقدامات کرتے رہے جن سے یہ امتیازات باہمی منافرت کا سبب بنتے جائیں۔ ان اقدامات میں ضربِ آخر' مغربی پاکستان کی وحدت کا خاتمہ اور مغربی اور مشرقی پاکستان میں آبادی کے تناسب سے نشستوں کا تعین تھا۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے ختم کر دینے کا نتیجہ ہے کہ آج سندھ اور پنجاب میں' دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم کے سوال پر اس انداز سے گفتگو ہوتی ہے جس انداز سے دریائے گنگا کے پانی کی تقسیم پر بھارت اور پاکستان میں مذاکرات ہوتے ہیں اور مشرق ومغرب میں (PARITY) کے ختم کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہم نے مملکتِ پاکستان کے معاملات کے آخری فیصلہ کا اختیار ان ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دیا ہے'

جن کا منتہائے نگاہ پاکستان کے وجود کو ختم کر دینا ہے۔ مشرقی پاکستان کا ہندو جانتا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی اکثریت کا راز، ان کے دو ووٹوں میں مضمر ہے — وہ ان سے اپنی قیمت کیوں نہ مانگے گا۔ اور ان کی مانگ جو ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہمیں مغرب کی غیر مقید جمہوریت نے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اگر ہماری جمہوریت، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں سے مشروط ہوتی تو

(۱) غیر مسلم پاکستان کی مسلم قوم کا جزوِ شمار ہی نہ پا سکتے۔

(۲) بنگالی اور غیر بنگالی میں کسی قسم کی کوئی تمیز روا نہ رکھی جاتی۔ انما المؤمنون اخوۃ کے مطابق سب ایک دوسرے کے بھائی ہوتے۔

(۳) نہ مغربی پاکستان کے حصے بخرے ہوتے، نہ ان میں الگ الگ حکومتیں قائم ہوتیں۔

(۴) نہ امت میں پارٹیوں کا وجود ہوتا نہ ان میں باہمی رقابت و منافرت ہوتی۔

(۵) غیر منقسم مملکت ہوتی جس کا ایک مضبوط مرکز ہوتا۔ مملکت میں وحدانی انداز کی حکومت ہوتی۔ ایک پارلیمان ہوتی جو قرآن کے غیر متبدل اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے عملی ذرائع اختیار کرنے کا سوچتی۔ ایک قانون ہوتا جو سارے ملک میں نافذ ہوتا۔ ایک اقتصادی نظام ہوتا جس میں نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت ہوتی، نہ کوئی رات کو بھوکا سوتا۔

یہ باتیں تو بہت دور کی ہیں، اور ہماری نئی نسل انہیں مقدس آرزوئیں، اور اگلے زمانے کی کہانیاں کہہ کر، اور طنز کی ہنسی ہنس کر آگے بڑھ جاتی ہے — اگر آئین سازی کے سلسلہ میں اتنی سی شرط بھی عاید کر دی جاتی کہ اس کے لئے $\frac{2}{3}$ کی اکثریت ضروری ہوگی، تو بھی موجودہ بحران پیدا نہ ہوتا۔ بہرحال اس وقت ہم بیم و رجا کے جس دوراہے پر کھڑے ہیں اس کے پیشِ نظر کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ جب یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچے صورتِ حالات کیا ہو۔ اس وقت ہم صرف ایک گزارش ضروری سمجھتے ہیں، اور وہ یہ کہ ہر بہی خواہِ مملکتِ پاکستان کا فریضہ ہے کہ وہ ملک میں کسی قسم کا ہنگامہ برپا نہ ہونے دے۔ موجودہ بحران سے پیدا شدہ نتائج کے ازالہ کی شکلیں نکل سکتی ہیں لیکن جو تباہی ہنگامہ آرائیوں اور تخریبی کارروائیوں سے آتی ہے اس کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ملک کی اقتصادی حالت اس نازک مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اگر یہاں امن و اطمینان کی اعتماد پرور فضا پیدا نہ ہوتی تو اس میں مزید زندہ رہنے کی سکت ہی نہیں رہے گی۔ لہٰذا اس وقت بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں امن و اعتماد کی فضا پیدا کر کے، اس کی اقتصادی حالت کی طرف تمام توجہات مبذول کی جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ پیپلز پارٹی کو اس کی اہمیت کا احساس ہوگا اور وہ اسے نظر انداز نہیں ہونے دے گی۔

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پیپلز پارٹی کے سربراہ، مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ اگر ہمیں اس امر کی ضمانت نہیں دی جاتی کہ عوامی لیگ کے چھ نکات میں مفاہمت کی گنجائش ہے' تو ہمارا ڈھاکہ جانا بے کار ہے — ہم آئین سازی کے کام میں شرکت نہیں کرینگے۔ مسٹر بھٹو کا یہ فیصلہ، عوامی لیگ کے طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر فیصلہ یہی ہے کہ آئین، چھ نکات کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے گا تو پھر ان پارٹیوں کا' جو ان نکات میں ترمیم چاہتی ہیں' اسمبلی میں شرکت کرنا بیکار! (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) خود اسمبلی اور اس کے اجلاس کا تقرر ہی بے معنی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک رسم کا پورا کرنا — اس صورت میں معاملہ عوامی لیگ اور صدرِ مملکت کے درمیان رہ جاتا ہے۔ عوامی لیگ اپنے آئین کا مسودہ صدرِ مملکت کے پاس بغرضِ تصویب بھیجدے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ مسٹر بھٹو کے اس فیصلہ سے کم از کم اتنا تو ہوگا کہ آنے والا مورخ جب اس بدنصیب ملک کی تباہی کی خونفشاں داستان رقم کرے گا تو اس میں یہ لکھا جائے گا کہ اس قتل نامہ (DEATH WARRANT) پر پیپلز پارٹی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے ایک ایسی بات کہی ہے جو اربابِ فکر و نظر کے لئے بڑے دور رس معانی کی غماز ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "بھارت کی دشمنی اور پیپلز پارٹی کی طرف سے عوامی لیگ کے چھ نکات تسلیم نہ کئے جانے کی بنا پر وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے کہ پیپلز پارٹی کے منتخب ارکانِ اسمبلی کو دوہرے یرغمال میں رکھنے کی پوزیشن قبول کرلیں۔" (مساوات۔ ۱۷ر فروری)

ہم اس سلسلہ میں' مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی سے بھی وہی درخواست کرینگے جسے ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ یعنی وہ آئین سازی کے مسئلہ میں شرکت کریں یا نہ کریں' اس کی خاص احتیاط برتیں کہ ملک میں کسی قسم کی بدامنی اور خلفشار پیدا نہ ہو۔ ملک کی جس سالمیت اور خیر طلبی کے لئے وہ چھ نکات پر رضامند نہیں ہو رہے۔ اسی کے لئے اشد ضروری ہے کہ ملک میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہ ہونے پائے۔

—— (۰) ——

پرچہ کی کاپیاں پریس میں بھیجنے کا وقت آپہنچا ہے۔ اس لئے ہم سردست اسی پر اکتفا کرتے ہیں — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک — ایک ماہ نامہ کی یہی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ برق رفتاری سے بدلتے والے واقعات کا ہمرکاب نہیں ہو سکتا۔ بہرحال' اصولاً ہم نے جو کچھ کہنا تھا' وہ کہہ دیا ہے۔ جزءً جو کچھ ہوگا اسے لاچار دیکھتے جائیں گے — اگر قرآن مجید کی روشنی میں آئین مرتب کیا جائے تو اس کے خط و خال کیا ہوں گے' اس کے متعلق ہم تفصیل سے سابقہ اشاعت میں لکھ چکے ہیں۔ ہم اس مقالہ کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کر رہے ہیں' اور اس کا انگریزی ایڈیشن بھی۔ تجویز یہ ہے کہ اردو اور انگریزی پمفلٹس کی کاپیاں مجلس آئین ساز کے منتخب ارکان تک پہنچا دی جائیں۔ اس سے (کم از کم) ہمیں اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ ہم نے ایسے نازک وقت میں خدا کی بات ان

ذمہ دار حضرات تک پہنچا دیکا ـــ یہی طلوعِ اسلام کا مشن ہے۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْہِ اُنِیْبُ ۔

---

(۲)

ہندو نے ایک بار پھر بتا دیا کہ وہ کیا ہے؛ اور مسلمان جو اس پر اعتماد کر لیتا ہے، وہ اس کے متعلق کس قدر غلط اندازہ لگاتا ہے۔ اغوا شدہ ہوائی جہاز میں جو پچیس چھبیس ہندوستانی مسافر یہاں آ پہنچے تھے، وہ بغیر ویزا کے پاکستان میں داخل ہو گئے تھے اور قانوناً پاکستان انہیں قید کر سکتا تھا۔ انہیں یہاں روک لیا ہوتا تو بھارتی مہادیو گھٹنوں کے بل جھک کر گڑگڑاتے۔ لیکن مسلمان اپنی روایات سے مجبور ہو گیا اور انتہائی کشادہ ظرفی کا ثبوت دیا۔ ان مجرموں کو مہمان رکھا۔ ان کی انتہائی خاطر تواضع کی۔ انہیں بحفاظت ان کے مامن تک پہنچایا۔ جب وہ وہاں پہنچ گئے تو ہندو نے اپنی دنائت اور کمینگی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ حکومتِ پاکستان نے اس پر انتہائی برداشت اور بردباری کا ثبوت دیا ہے لیکن ہندو، حسبِ عادت، سر پر چڑھتا جا رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کو (جسے ہندو کے ساتھ کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا) معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندو کیا ہے لیکن ہندو کا علاج، رواداری اور حسنِ سلوک نہیں۔ وہ صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتا ہے۔ اس کی ساری تاریخ اس کی شاہد ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تو اربابِ حل و عقد کا کام ہے کہ اس کا مناسب وقت کون سا ہوگا، لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ جب تک ہندو کے ساتھ فیصلہ کن جنگ نہیں ہوتی، نہ وہ خود چین سے بیٹھے گا نہ کسی ہمسایہ کو چین سے بیٹھنے دے گا۔ جہاں تک ہماری قوم کا تعلق ہے، ہمیں یقین ہے کہ وہ اس کے لئے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ ۱۹۶۵ء میں دنیا اس کا مشاہدہ کر چکی ہے اور جب بھی پھر وقت آیا، قوم اسی قسم کے کردار کا ثبوت دے گی، اور اپنے محبوب عسکری جیالوں کے پیچھے آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے گی۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے ـــ بمقام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ـــ ہوتا ہے۔

(ناظم)

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کسی زمانے میں ہمارے ہاں مناظروں کا بہت زور ہوا کرتا تھا اور ان سے اس ہنگامہ پسند قوم میں بڑی گہما گہمی رہا کرتی تھی۔ لیکن جب سے مولوی صاحبان نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے، مناظروں کی وہ بات نہیں رہی۔ اب ہنگاموں کی شکل بدل گئی ہے۔ بایں ہمہ کبھی کبھی ان کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دے جاتی ہے۔ مناظرہ کا اسی قسم کا ایک منظر ترجمان القرآن کی فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ حالیہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی شکست کے سلسلہ میں قادیانی جماعت کے نقیب "الفضل" کے مدیر روشن دین تنویر صاحب نے، مدیر ترجمان القرآن کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ کہا کہ جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۳ء میں "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تو مودودی صاحب کو پھانسی کی سزا ملی۔ اور اب پھر اس جماعت نے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تو انتخابات میں انہیں شکست فاش ہوئی۔ یہ دونوں واقعات احمدیہ جماعت کی صداقت کے نشانات ہیں (یہ حضرات ہمیشہ اس قسم کے دلائل دیا کرتے ہیں)۔ ترجمان القرآن نے تنویر صاحب کا یہ خط شائع کر کے اس کا جواب دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جماعت اسلامی کی اس ناکامی کا باعث، خود یہ جماعت نہیں بلکہ اس کے اسباب خارجی تھے جن پر جماعت کو کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ یہ جواب ویسا ہی رکیک اور مضحکہ انگیز ہے جیسا تنویر صاحب کا دعویٰ۔ مناظروں میں یہی ہوا کرتا ہے۔ آیئے، کچھ وقت کے لئے آپ بھی اس جواب سے لطف اندوز ہو جائیے کہ زندگی میں تفریح کے لئے بھی کچھ لمحات ہونے چاہئیں۔

(۰)

ترجمان القرآن لکھتا ہے۔

> جماعت اسلامی کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ جسے ہمارے اکثر و بیشتر خیر خواہ نظر انداز کر رہے ہیں وہ بین الاقوامی حالات کی ناسازگاری ہے۔ وہ خارجی قوتیں جو اس وقت اسلام اور خصوصاً احیاء اسلام کی ہر ابھرنے والی تحریک کے خلاف دنیا بھر میں کارفرما ہیں ان کی وسعت اور اثر آفرینی

کا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں کیا جاتا۔ پوری دنیا اگرچہ اس وقت دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے مگر عملاً ان دونوں کیمپوں میں ایک ہی نظام کے تسلط اور حفظ و بقاء کے لئے سپاہ تیار کی جا رہی ہے اور وہ ہے نظامِ مادیت۔ اس نظام کے افکار و نظریات کی فنی پیچیدگیوں کو چھوڑ دیا جائے تو اسے مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ نظامِ مادیت ایک ایسا ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جس میں عمل کے محرکات، خوب و ناخوب کے پیمانوں اور مقصد و منہاج کا تعین سراسر دنیوی اور مادی سود و زیاں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں جو چیز یا نظریہ اس بنیاد سے بے تعلق ہے وہ بالکل غیر ضروری اور بے اثر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس نظام کے ماننے والے منکرِ خدا، دہریے اور کافر ہوں۔ مگر یہ بات ضروری ہے کہ وہ اجتماعی زندگی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی پرچھائیں تک پڑنے نہیں دیتے۔ اگر ان پر ایمانیات کا کوئی معمولی اثر ہوتا بھی ہے تو وہ ان کے دل کے کسی گوشے میں ہوتا ہے۔ ان کی حیاتِ اجتماعی دینی اور مذہبی اثرات سے یکسر خالی رہتی ہے۔

اس کے بعد، انہی بین الاقوامی حالات میں، ترجمان القرآن نے سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اجتماعیت پسندانہ سرمایہ داری کا ذکر کیا ہے، جو اس کے نزدیک اشتراکیت کا دوسرا نام ہے۔ ان حالات کے تذکرہ کے بعد وہ لکھتا ہے۔

اب جو تحریکیں اس سیلاب کو روکنے کے لئے کام کر رہی ہیں، ان کی بے بسی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک طرف تو انہیں وقت کے غالب افکار و رجحانات اور تصورات کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف اس جدوجہد کے لئے انہیں جس قدر وسائل درکار ہوتے ہیں ان کا عشرِ عشیر تو کیا، ان کا کروڑواں حصہ بھی فراہم نہیں ہوتا۔ پھر ان کے تسلط کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں جو مرعوبیت بلکہ مغلوبیت پائی جاتی ہے، اس سے بھی انہیں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ اس باطل نظام نے اپنی عملداری کے لئے زیرِ زمین بھی اور بالائے زمین بھی، سازشوں کا ایک نہایت وسیع اور پیچیدہ نظم قائم کر رکھا ہے جس کے لئے ملک کے اندر بھی بہت سی طاقتیں کام کر رہی ہیں اور ملک کے باہر سے عالمی طاقتیں بھی ان کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ یہ تحریکات تعداد میں اس قدر زیادہ اور اپنے پروگراموں کے اعتبار سے اس قدر وسیع اور طریقہائے کار کے لحاظ سے اتنی متنوع اور اثرات کے اعتبار سے اتنی ہمہ گیر ہیں کہ اسلامی تحریکوں کے لئے ان کا مقابلہ عالمِ اسباب میں جوئے شیر لانے سے کچھ کم دشوار نہیں ہے۔ جونہی کوئی دینی

تحریک معرضِ وجود میں آئی ہے، اسی وقت تمام اسلام دشمن تحریکیں مل کر اسے برباد کرنے کے لئے اپنے اپنے پروگرام لے کر میدان میں آجاتی ہیں اور ہر طرف سے اس پر یلغار کرتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ مصر میں اخوان المسلمین کا جو حشر ہوا ہے اور اس کے خلاف دنیا میں حقارت و نفرت کے جو جذبات پھیلے ہیں اور اس کی بربادی پر دنیا کے مختلف ممالک اور طبقوں میں خوشی کے جو شادیانے بجے ہیں کیا وہ محض مصر کے چند حکمرانوں کی کوششوں کے نتائج ہیں؟

اس کے بعد تحریر ہے۔

اسی پسِ منظر میں ذرا جماعتِ اسلامی کی مشکلات کا بھی اندازہ لگائیے۔ ڈھائی ہزار ارکان پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت جس کے ہمدردوں کی تعداد چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں ہے، جس کے وسائل انتہائی قلیل ہیں اور جس کی مادی قوت نہایت ہی کم ہے، اس کے پیچھے ایک دنیا ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے۔

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ملک میں جس قدر حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے بھی جماعتِ اسلامی کو دبانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ان تمام مخالف عناصر کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

اتنے ہمہ گیر طوفان کا مقابلہ ایک کمزور سی جماعت کہاں تک کر سکتی تھی۔

آپ نے ترجمان القرآن کے پیش کردہ اسبابِ ناکامی ملاحظہ فرمالئے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس باب میں امیر جماعت کی کسی قسم کی غلطی کو کوئی دخل تھا یا جماعت کی پالیسی کا کوئی واسطہ۔ تمام اسباب خارجی تھے جن پر جماعت کو کوئی اختیار نہیں تھا۔

بہت اچھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک سوال ابھرتا ہے جس پر آپ غور فرمائیے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اسباب ایسے تھے کہ یہ ۶ دسمبر کی شام اور ۷ دسمبر (انتخابات کے دن) کی صبح کے درمیان اچانک نمودار ہو گئے تھے۔ اگر صورت ایسی ہوتی کہ (مثلاً) آپ نے کھلے میدان میں جلسہ کا انتظام کیا تھا۔ اس کے لئے شامیانے لگائے، بجلی کے قمقمے نصب کرائے، لیکن عین جلسہ کے وقت، بالکل غیر متوقع طور پر، باد و باراں کا طوفان اٹھا اور یہ سارا انتظام درہم برہم ہو گیا، اس وقت اس قسم کی مدافعت قابلِ پذیرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ جن اسباب کا تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ برسوں سے آپ کے سامنے موجود تھے۔ آپ ان کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ آپ کے امیر کی "مفکرانہ نگاہیں" ان کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں۔ ان کی انگلیاں نبضِ زمانہ پر تھیں لیکن ان سب کے باوجود، وہ چھ دسمبر کو پورے حتم و یقین کے ساتھ بہ بانگِ دہل فرماتے تھے کہ جماعتِ اسلامی کے شکست

کھا جائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیا اس دن تک آپ کے امیر یا دیگر اربابِ جماعت کو وہ عناصر نظر نہیں آتے تھے جنہیں آپ اب اپنی ناکامی کے اسباب قرار دے رہے ہیں! یہ ہوتا ہے شخصیت پرستی کا نتیجہ جس میں کوئی شے اپنی اصلی ہئیت میں سامنے آنے ہی نہیں پاتی۔

اور یہ ہم نے محض قیاساً نہیں لکھ دیا جس مقصد کے لئے ترجمان القرآن میں یہ کچھ لکھا گیا ہے اسے اس نے آگے چل کر خود ہی افشا کر دیا ہے۔ تحریر ہے۔

> بعض بہی خواہوں کی طرف سے جماعت کو زیادہ سرگرم اور عوامی بنانے کے لئے یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ اس کی امارت کا بار کسی دوسرے زیادہ سرگرم قائد کے کندھوں پر ڈال دیا جائے اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جماعت کی سرپرستی کا کام سپرد کر دیا جائے۔

اس کے بعد ترجمان القرآن کا کربِ اضطراب قابلِ دید ہے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ توبہ کیجئے۔ ہزار بار توبہ کیجئے۔ ایسا خیال بھولے سے بھی دل میں نہ لائیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ذات گرامی منفرد ہے۔ ان کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کی جگہ قیادت کسی اور کے سپرد کر دی جاتی ہے تو اس سے جماعت ختم ہو جائے گی، اور ظاہر ہے کہ جب جماعت ختم ہو جائے گی تو اسلام ہی ختم ہو جائے گا۔

"خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے" (صـ۹)

آپ نے غور فرمایا کہ جماعتِ اسلامی کی اس ذلت آمیز شکست کے اسباب کی تلاش میں معتقدین کی نگاہوں کا رخ خارجی عناصر کی طرف منتقل کرانے کا مقصد کیا ہے! یہی کہ شخصیت پرستی کے اس بت کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

اور مودودی صاحب نے تو اپنی ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی تقریر میں (جو انہوں نے کارکنانِ جماعت سے لاہور میں کی تھی) اپنے معتقدین کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جو شخص اس شکست کو شکست کہتا ہے وہ حالات سے بے خبر ہے۔ یہ ہماری شکست نہیں کامیابی ہے۔ اس کا صغریٰ کبریٰ یوں قائم ہوتا ہے۔

(۱) ہم نے اپنی دعوت کو تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود رکھا تھا۔

(۲) اس ملک میں ۸۵ فیصد آبادی ناخواندہ ہے۔ خواندگی کا اوسط تقریباً پندرہ فیصد ہے اور ان میں بھی جس حصے کو پڑھا لکھا کہا جا سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ سات آٹھ فیصد ہے۔ ہم نے ملک کے آدھے حصے میں جو ووٹ حاصل کئے ہیں وہ کل استعمال شدہ ووٹوں میں ۴ اور ۵ فیصد کے درمیان ہیں۔

(۳) ان انتخابات میں جماعت نے تمام نشستوں پر نہیں بلکہ آدھی سے کم نشستوں پر آدمی کھڑے کئے تھے۔ ان میں ہمارے براہِ راست کھڑے کئے ہوئے آدمیوں اور ہماری تائید سے کھڑے ہونے والوں کو مجموعی طور پر ۲۵ لاکھ ووٹ ملے ہیں۔ (ایشیا - ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء)

فرمایئے! یہ ہماری شکست ہے یا کامیابی! اسے شکست قرار دینے اور ایسا سمجھنے والا جاہل نہیں تو اور کیا ہے؟

امیر جماعت نے یہ فرمایا اور حلقۂ مریدین نے سبحان اللہ کے نعرے بلند کئے۔

(۰)

ترجمان القرآن کی مذکورہ بالا اشاعت میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ ایک اور "حقیقت" بیان ہوئی ہے۔ انتخابات کے بعد ملک میں جو ہنگامے برپا ہو رہے ہیں، ان کے متعلق ایک سطحی نگاہ رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ جو جماعتیں انتخابات میں ناکام رہ گئی ہیں، ان کا آخری حربہ یہ ہے کہ ملک میں امن و سکون کی فضا قائم نہ ہونے پائے تاکہ کامیاب جماعتیں اپنی حکومت قائم نہ کر سکیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں جماعت اسلامی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ حضرات اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

> یہاں کے دو صوبوں میں ایک ایسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہوئی ہے جو اپنے آپ کو اشتراکیت کی حامی کہتی ہے۔ جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں امن و امان کی فضا قائم ہو اور اس پارٹی کے ارکان مسند اقتدار سنبھالنے کے بعد جمہوری روایات اور طریقوں کے مطابق اپنے ان منصوبوں پر عمل کریں جو ان کے پیش نظر ہیں اور جن کا وعدہ کر کے انہوں نے عوام سے ووٹ حاصل کئے ہیں۔ اب اس پارٹی کے ہر چھوٹے بڑے کارکن کا انداز فکر و عمل سراسر تعمیری ہونا چاہیئے اور اسے اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ملک تعمیری راستے پر گامزن ہو۔ مگر یہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک طرف تو اس پارٹی کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر اختلاف کرنے والوں پر برس رہا ہے اور انہیں المناک عذاب کی وعید سنا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے کارکن ملک کے اندر افراتفری کی فضا قائم کرنے میں مصروف ہیں اور ہڑتالیں کروا رہے ہیں۔ ان سب حرکتوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ ملک کی سیاسی گاڑی جو خوش قسمتی سے جمہوریت کی پٹڑی پر کسی طرح چڑھ گئی ہے، اسے پھر پٹڑی سے اتار دیا جائے اور ملک میں آمریت، تشدد اور لاقانونیت کی فضا قائم ہو۔

یعنی جن پارٹیوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور مغربی پاکستان کے دو بڑے صوبوں میں جن کی حکومت کے امکانات مسلّم ہیں، ان کی اب یہ کوشش ہے کہ ملک میں ہنگامے برپا کرائے جائیں تاکہ ان کی حکومت قائم نہ ہو سکے!!!

آپ سوچیئے کہ اس قسم کی لچر پوچ باتوں کو عقیدت مندی کے جادو کے سوا اور کس طرح منوایا جا سکتا ہے!

اور اس پر اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کا مخاطب، ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ اگر ان کے ہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی فکر و بصیرت کا یہ عالم ہے، تو ان کے ان پڑھ وابستگانِ دامن کی جو کیفیت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ مسیح ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات ومنات

دنیا ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اندر کچھ لوگوں میں محاسبۂ خویش کا احساس بیدار ہو رہا ہے اور انہوں نے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد جماعتِ اسلامی ضلع ڈیرہ غازی خان کے امیر ہیں جو قومی اسمبلی کی رکنیت کے لئے منتخب ہوتے۔ ان کا ایک انٹرویو ۴ر جنوری ۱۹۷۱ء کے روزنامہ کوہستان میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی جماعت کی اس ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

(۱) جماعتِ اسلامی نے تعلیم یافتہ افراد تک اپنے کام کو محدود رکھا۔ اس کا پس منظر (؟) یہ تھا کہ یہی لکھے پڑھے افراد عوامی قیادت سنبھال لینگے۔ ادھر عوام نے جماعت کے اس اندازے کو غلط ثابت کر دکھایا اور اپنی قیادت کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ عوامی قیادت کا بوجھ اٹھانے کے لئے صرف پڑھا لکھا ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ عوام کے دکھ درد اور ان کے مسائل اور مصائب میں ان کا ساتھی بننے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر عوام کی جگہ کھڑے ہو کر مار کھانی چاہیئے تاکہ عوام اطمینان کیساتھ اعتماد کر سکیں۔ مان لیجئے کہ جماعتِ اسلامی کے اکثر کارکن خود کو عوامی قیادت کے اس معیار کا اہل ثابت نہیں کر سکے۔

(۲) معاشی پروگرام کے سلسلہ میں، بدقسمتی سے جماعت کا اندازہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔ یہ سوچ کی ایک غلطی تھی۔ مگر اس سوچ میں نیت کا فتور شامل نہیں تھا۔

(۳) جماعت کا ایک غلط طرزِ فکر یہ بھی تھا جو اس نے نچلے اور دبے ہوئے عوامی طبقات کے سلسلہ میں اختیار کیا اور انہیں استحصال پسندوں کے چنگل سے نکلانے کے لئے وہ موثر کردار ادا نہیں کیا جس کی جماعتِ اسلامی جیسی منظم نظریاتی" انقلابی قوت سے توقع ہو سکتی تھی۔

(۴) یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ مولانا مودودی کو اپنے معیار کے بہت کم ساتھی ملے ہیں۔

(۵) اس سوال کے جواب میں کہ "جماعت کے اسٹیج پر ایسے افراد نمودار ہو گئے جو عوام میں بدترین شہرت کے حامل تھے" انہوں نے کہا کہ یہ درست ہے لیکن جماعت نے انہیں کبھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا اور نہ ہی وہ انہیں کوئی اونچا درجہ دیتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس جماعت کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقعہ ہے کہ جماعت کے اندر سے کسی نے اس قسم کی تنقیدی آواز اٹھائی ہو اور اسے جماعت سے خارج نہ کیا گیا ہو' ورنہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا کہ جس شخص نے محاسبۂ خویش کا احساس دلایا،

سے جماعت سے نکال باہر کیا گیا۔ (مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے رفقاء کے گروہ کا جرم اتنا ہی تھا) ہمیں امید ہے کہ اگر یہ احساس پرورش پاتا رہا تو اس جماعت کے سوچنے والے ذہن بہت جلد اس حقیقت کو پالیں گے کہ ان کی جماعت کی ناکامی اور عدمِ مقبولیت کا حقیقی سبب ان کے امیر کی وہ دو رخی پالیسی ہے جس کی بنا پر وہ ہیں کچھ اور، اور بنتے کچھ اور ہیں۔ ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان سے کہتے کچھ اور ہیں۔ ان کے مقاصد کچھ اور ہیں اور انہیں دکھاتے کچھ اور بنا کر ہیں۔ جب تک یہ ملمع قائم رہا جماعت کی ساکھ قائم رہی۔ اب یہ اترنا شروع ہو گیا ہے۔ اس لئے حقیقت لوگوں کے سامنے عریاں ہو کر آ رہی ہے۔ ہر فریب کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔

(*)

اِنسانی مسائل کے حل کیلئے

عقلِ انسانی آجتک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی۔

ہزاروں کتابوں کا نچوڑ، افلاطون اعظم سے لے کر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرینِ معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟ اسے پڑھیئے اور سوچیئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت
بارہ روپے

ملنے کا پتہ
ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

شاہد عادلی
ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

"مفکرِ اسلام" اور ماہر تعلیم

قارئین کو شاید یہ تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے "مفکرِ اسلام" کون ہیں؟ اگر نہیں تو وہ جماعتِ اسلامی کے کسی اخبار یا رسالے کے ایک دو شماروں کا مطالعہ کر لیں تو ان پر یہ راز منکشف ہو جائے گا کہ پاکستان میں صرف ایک ہی "مفکرِ اسلام" ہیں اور وہ ہیں جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، امیر جماعتِ اسلامی پاکستان۔ ان کی "فکرِ اسلامی" کی جھلکیاں قارئینِ طلوعِ اسلام کی نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ ان کے مفکرِ اسلام ہونے کا پروپیگنڈا تو جماعتِ اسلامی کے اخبارات و رسائل میں لگاتار ہوتا رہتا ہے، لیکن یہ کہ یہ "مفکرِ اسلام" ماہرِ تعلیم بھی ہیں اس کے متعلق شاید جماعت کے بھی بعض حضرات کو علم نہ تھا۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب پچھلے سال اسلامی سربراہوں کی رباط کانفرنس کے اعلان کے ساتھ ہی آپ کو بجلی کی تیزی سے بطور "ماہرِ تعلیم" رباط (مراکش) پہنچا دیا گیا۔

رباط میں آپ نے بطور ماہرِ تعلیم کیا خدمات انجام دیں، کچھ عرصہ تک ہمیں ان کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ پچھلے دنوں ایک دوست نے مراکش سے ایک عربی ماہنامہ "دعوت الحق" بابت مئی ۱۹۷۰ء ارسال کیا جس سے ان تفصیلات کا کچھ علم ہوا۔ یہ ہے ایک اسلامی یونیورسٹی کا نقشہ جو رسالہ کی مذکورہ بالا اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ قارئین شاید یہ خیال کرتے ہوں کہ یہ نقشہ کوئی نئی علمی چیز ہوگی۔ جی نہیں! یہ مودودی صاحب کے ایک دس سالہ پرانے اردو مضمون کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے اور یہی نہیں، بلکہ ان کا وہ دس سالہ پرانا اردو مضمون بھی اس سے بھی دس سال پرانے، جماعتِ اسلامی ہند کے کسی صاحبِ علم کے ایک عمدہ مضمون کا ناقص چربہ تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ۱۹۶۲ء میں مشہور روسی عالم موسیٰ جار اللہ کے ایک خط کے جواب میں جماعتِ اسلامی کی جانب سے یہ تاریخی جواب دیا گیا تھا کہ برصغیر ہند و پاک کے علماء اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں (اس کی تفصیلات ہم "جماعتِ اسلامی اور علماء" کے عنوان سے طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں پیش کر چکے ہیں) چنانچہ اس کے فوراً بعد جماعتِ اسلامی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جدید قسم کے علماء دین تیار کرنے کے لئے کوئی درس گاہ قائم کرے۔ ان دنوں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ ان بیچاروں کو اپنی ساری قوت اسکی مخالفت کے لئے صرف کرنی پڑ رہی تھی اس لئے اس قسم کے تعمیری کام کے لئے ان کے پاس کوئی وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ اسی دوران میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا اور جماعتِ اسلامی کے بڑے بڑے لیڈر امیرِ جماعتِ اسلامی سمیت

یہاں تشریف لے آئے۔ یہاں کی مصروفیات کچھ اس قسم کی ہو گئیں کہ ابھی تک ان کو ایسا ادارہ قائم کرنے کی فرصت نہیں مل سکی۔ البتہ جماعت اسلامی ہند نے ۱۹۵۶ء میں ایک ایسی درس گاہ کی بنیاد رکھ دی جس کا نصاب اور دوسری تفصیلات قیم جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف نے مرتب کیں اور انہیں جماعت اسلامی ہند کے ترجمان ماہنامہ "زندگی" رامپور کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شائع کرا دیا جدید قسم کے علماء تیار کرنے کے لئے اس درس گاہ میں داخلے کے لئے ۔۔۔ انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی تعلیم شرط قرار دی گئی (صفحہ ۶۲) اور پھر یہ کہ ہر جماعت اور مضمون کے لئے معیاری عربی کتب کا نصاب مرتب کر دیا گیا۔ اس نصاب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ صاحب نصاب کو فن تعلیم میں کچھ درک ضرور حاصل ہے اور ان کے مرتب کردہ نصاب اور پروگرام سے جو علماء دین تیار ہوں گے وہ زمانے کے تقاضوں سے کسی حد تک واقف ہو جائیں گے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور مودودی صاحب بھی اس کے ایک رکن نامزد کئے گئے۔ آپ وہاں اجلاس میں تشریف لے گئے تو پیچھے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ آپ کو مدینہ یونیورسٹی کا تعلیمی نقشہ مرتب کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ بعد میں یہی تعلیمی نقشہ "ترجمان القرآن" بابت ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ لیکن مدینہ یونیورسٹی کا نصاب جن بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے وہ جامعۃ الازہر سے تو ملتی جلتی ہیں لیکن وہاں مودودی صاحب کی اسلامی یونیورسٹی کے نقشے کی موجودگی تو کجا اس کی کوئی معمولی سی جھلک بھی نہیں پائی جاتی۔ مودودی صاحب کا یہ نقشہ مولانا محمد یوسف کی اسلامی درس گاہ کا ناقص سا چربہ ہے۔ مثلاً جناب محمد یوسف نے جس اسلامی درس گاہ کا نقشہ پیش کیا تھا اس میں داخلے کے لئے انٹرمیڈیٹ یا مساوی تعلیم شرط تھی۔ لیکن مودودی صاحب نے اپنے نقشے میں اس شرط کو اڑا دیا اور اس کی جگہ یہ تجویز پیش کی کہ مجوزہ اسلامی یونیورسٹی میں انگریزی، جرمن یا فرانسیسی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان داخل نصاب کی جائے حالانکہ علماء کو جدید زمانے کے تقاضوں سے جو واقفیت جدید نظام تعلیم کے کسی ادارے میں رہ کر ہو سکتی ہے وہ کسی غیر ملکی زبان کے پڑھنے سے نہیں ہو سکتی۔ دوسرے محمد یوسف صاحب نے ہر درجے اور مضمون کے لئے بڑی معیاری عربی کتابوں کا نصاب مرتب کر دیا تھا۔ مودودی صاحب نصاب کے مسئلے ہی کو سرے سے گول کر گئے ہیں بلکہ اس بارے میں انہوں نے جو اشارات و کنایات فرمائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درس نظامی ہی کے نصاب کو کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ ترجیح دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر جناب محمد یوسف صاحب کی تجاویز کو اصلی حالت پر رہنے دیا جاتا تو وہ بدرجہا بہتر تھیں۔

موٹر سائیکل چلانا سیکھنے سے علماء جدید بن جائینگے

یہ نہیں کہ مودودی صاحب نے محمد یوسف صاحب کی مجوزہ سفارشات پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ایک "انوکھا اضافہ" کر کے اپنے ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت دیا ہے اور وہ ہیں غیر نصابی سرگرمیوں کی تفصیلات۔

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

طلوعِ اسلام کنونیشن سنہ ۱۹۷۰ء

مذاکرہ

عنوان :- "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے !"

مذاکرہ کی تقاریر کی قسط اول طلوعِ اسلام بابت جنوری سنہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب بقایا تقاریر شائع کی جاتی ہیں

خالدہ عندلیب
(سال دوم کی طالبہ)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

محترم صدر صاحب اور معزز سامعین !

آج کا موضوع ہے : "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے ؟"

میں اپنے بزرگوں اور علامہ اقبالؔ کی روح سے معذرت چاہتی ہوں کہ تھوڑی سی تبدیلی کی جسارت کر رہی ہوں میں یوں کہوں گی : "اب تو ہی بتا تیری مسلمان کدھر جائے ؟"

آپ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالیں۔ ساری مخلوق میں کون ہے جس کا نالہ شب گیر، صبح بلاخیز، آہ شرر ریز، سب سے زیادہ ایوانِ خالق کو دعا، سوال اور احتجاج بن کر پکارتی رہی ہے۔ یہ پابندِ سلاسل، غلامی اور محکومی، محتاجی اور محرومی کا نقشِ ناتمام عورت کے سوا کون ہو سکتی ہے۔ اس کے انسان ہونے پر شک رہا ہے مگر شئے خرید و فروخت ہونے پر یقین۔ اسے نیلام بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے جوہرِ انسانیت پر شک رہا ہے مگر گناہ کا سرچشمہ اور برائیوں کا مجسمہ ہونے پر یقین۔ اس کے پیکر میں روح ہونے پر شک رہا ہے مگر روحانیت کی ترقی کے لئے اس سے دوری پر یقین، بلکہ سالوں کی پالی ہوئی بیچارے مرد کی روحانیت عورت پر اک نگاہ پڑنے سے رخصت ہونے پر یقین۔ وہی عورت جس کے بطن سے اس نے جنم لیا، جس کے دودھ پر وہ پلا۔ اس کی سیرت و کردار پر شک مگر دھاگے کی گرہ پر یقین۔ سنا ہے عرب سفر پر روانہ ہوتے وقت درخت پر دھاگے سے گرہ لگا جاتے تھے۔ واپسی پر اگر گرہ موجود نہ ہوتی تو سمجھ لیتے کہ عورت بدکرداری کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس کی اپنی الگ ہستی ہونے پر شک ہے مگر مرے ہوئے خاوند کے ساتھ جل مرنے پر یقین۔ اس کی صلاحیتوں پر شک ہے لیکن گھر میں محبوس اور معذور، مجبور اور مقہور، محتاج اور مغلوب رکھنے پر یقین۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

دانشوروں کی دانش، فلسفیوں کا فلسفہ، عالموں کا علم، اہلِ دل کے قصیدے اور مرثیے، منبر و محراب کے مقدس فتوے ۔۔۔ کوئی بھی تو اُسے مثبت مقام کا پتہ نہیں دیتا۔ کسی کے پاس اس کے لئے کوئی پیغام نہیں۔

اس دورِ پُرفریب میں کس بے بسی کے ساتھ
ہم پتھروں میں کوئی خدا ڈھونڈتے رہے

منبر و محراب کا نام سُنکر نہ چونکیں۔ آئیں آج کے سب سے بڑے اسلام پسند سے پوچھیں۔ اُن کی کتاب پردہ، اور حقوقِ زوجین کے آئینہ میں عورت کا چہرہ دیکھیں۔ بلیویں صدی میں فرماتے ہیں۔

عورت اور مرد کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ قانونِ زوجی ایک کائناتی ہمہ گیر قانون ہے۔ کائنات کی ساری ترکیبات اسی سے واقع ہوئی ہیں۔ زوجیت یہ ہے کہ ایک شے میں فعل ہو اور دوسری شے میں قبول ہو۔ فعل اپنی ذات میں قبول پر ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ فضیلت دراصل غلبہ، قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ اس قانون کا تقاضا ہے کہ مرد میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو۔ سختی، شدت اور تحکم ہو۔ اسے مردانگی کہتے ہیں۔ عورت میں مغلوبیت اور قبولِ اثر ہو۔ نرمی، لچک، اور لطافت ہو۔ اسے نسائیت کہتے ہیں۔ عورت میں ڈٹ جانے اور بھڑنے کی بجائے جھکنے اور ڈھل جانے کی صلاحیت ہے۔ بیباکی اور جسارت کی بجائے منع، فرار اور رکاوٹ ہے۔ جسے حیا کی جبلت سے سنجتہ کر دیا گیا ہے۔

آگے فرماتے ہیں :-

صلاحیتوں کی اِس فطری تقسیم کی وجہ سے مرد اور عورت کا دائرۂ عمل الگ الگ ہو گیا ہے۔ چنانچہ تمدن کی اہم اور محنت طلب ذمہ داریوں کا بوجھ مرد پر ڈالا گیا ہے۔ تمدن کے ہلکے اور سبک کام عورت کے سپرد کئے گئے ہیں۔ عورت کا مقام اندرونِ خانہ ہے اور مرد کا مقام بیرونِ خانہ ہے۔ اِس فطری تقسیم کی رُو سے مرد کو غلبہ، تحکم، شدت اور مزاحمت کی تعلیم دی جائے۔ عورت کو مغلوبیت کا سبق دیا جائے۔ یہی عورت کی فطرت ہے۔ عورت سے فائدہ اٹھانا ہو تو اُس کی فطرت پر قائم رہ کر اٹھا سکتے ہو۔ اگر اسے مردوں کی طرح سیدھا، اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے۔

پھر فرماتے ہیں۔

مردِ خاندان کا محافظ، قوام اور حاکم ہے۔ بیوی بچوں پر اُس کی اطاعت فرض ہے۔ اگر عورت اپنے خاوند کی اطاعت نہ کرے تو مرد پر لازم آتا ہے کہ پہلے نصیحت کرے۔ نہ مانے تو اُسے اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسبِ ضرورت سختی کرے۔ اگر اس پر بھی نہ مانے تو اُس کو مار سکتا ہے۔ یہاں تک

وہ اُس کی اطاعت کرنے لگے۔ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کے تابع ہے۔ نظامِ معاشرت کو اختلال اور برہمی سے بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عاید کیا گیا کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو، اس کی اطاعت کرے۔ خواہ وہ اس کا شوہر، باپ یا بھائی ہو۔ وہ مرد کی مرضی کے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتی۔ عورت کو کسی محرم مرد کے بغیر سفر کی اجازت نہیں۔ طلاق دینے کا حق مرد کو ہے۔

دلیل ملاحظہ فرمائیں:۔

مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوقِ زوجیت حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ان حقوق سے دستبردار ہونے کا حق بھی اُسی کو دیا گیا ہے۔ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ اب کون حق رکھتا ہے کہ مرد سے یہ حق لے کر قاضی کو دے دے۔ ظاہر ہے جو شخص اپنا روپیہ خرچ کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اُسے آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور صرف اس وقت چھوڑے گا جب اُس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر عورت کو طلاق کا حق دیا جاتا تو وہ مردوں کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہوتی۔ عورت کو خلع کا حق ہے۔ وہ قاضی کے پاس جا کر فیصلہ لے لے۔

سامعین والا قدر! "پردہ" اور "حقوقِ زوجین" کے آئینے میں آپ کو عورت کا جو عکس نظر آیا ہے میں اُس کے خدوخال ذرا اُجاگر کر دوں۔ مرد کو عورت پر حکومت کا حق ہے اس لئے کہ وہ "مال" خرچ کرتا ہے۔ گویا عورت انسان نہ ہوئی کوئی شے ہوئی جسے خریدا جا سکتا ہے۔ صنفی تعلقات کے جملہ حقوق، مرد کو مہر کے چند ٹکوں کے عوض بیع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر عبادت کرنا ہو یا نفلی روزہ رکھنا ہو، تو پہلے مجازی خدا کی اجازت لے لے۔ ورنہ اُلٹی گنہگار ہوگی۔ گھر کی مالکہ ایسی کہ اگر ایک دانہ بھی کسی بھوکے کو صدقہ کرنا ہو تو مالک سے اجازت لے۔ مطیع ایسی کہ اختلاف کی صورت میں مار کھا کھا کر راضی برضا ہو۔ گھر میں راحت و سکون ایسا کہ دوسری تیسری بلکہ چوتھی بیوی اور لونڈیوں کی بھیڑ کا دھڑکا ہر وقت لگا رہے۔ تعلیم ایسی کہ مغلوبیت سرشت بن جائے۔ شوہر نیند میں پانی مانگے تو صبح تک گلاس پکڑے سرہانے کھڑی رہے۔ بااختیار اتنی کہ آقائے نامدار تین الفاظ ایک سانس میں یا تین سانسوں میں کہہ کر بیک بینی و دو گوش دروازے سے بیرونِ خانہ دھکا دے، تو اس قولِ فیصل میں قاضی صاحب بھی دخل نہ دے سکیں۔ یعنی نہ داد نہ فریاد۔ شخصی حکومت ایسی کہ شکایت کرنے والا بھی وہی، تفتیش کرنے والا بھی وہی، فیصلہ کرنے والا بھی وہی، اس پر عملدرآمد کرنے والا بھی وہی۔ عورت پر ظلم ہو تو علیحدگی کے لئے دکھڑا لے کر قاضی کے دربار میں مقدمہ چلیئے۔

فرماتے ہیں: عورت اور مرد کا تعلق تابع اور متبوع کا ہے، کھل کر کیوں نہیں کہتے۔ حاکم اور محکوم کا ہے۔ ظالم اور مظلوم کا ہے۔ خریدار اور جنس خرید کا ہے، جاگیردار اور جاگیر کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد نے عورت کی معاشی معذوری اور احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے

یہ ہر مفاد کے ساتھ ہوتا ہے کہ اُسے زیردست بنا لیا جاتا ہے۔ غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر کرنے کے لئے اُس کے دل میں بٹھایا جاتا ہے کہ وہ حاکم سے کمتر ہے۔ قدرت نے اُسے پیدا ہی اطاعت اور فرماں پذیری کے لئے کیا ہے۔ معاشرے میں اس کا اپنا کوئی مقام نہیں۔ حتیٰ کہ اس کا تعارف بھی اس کی اپنی ذات سے نہیں ہوتا۔ وہ زید کی لڑکی ہے، عمر کی بیوی ہے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ مرد کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور بس۔ وہ مرد کی ہم مقام نہیں، حکیم الامت فرماتے ہیں۔

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
ہیں مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اب تو ہی بتا تیری مسلمان کدھر جائے؟

عورت گھر میں ہو یا گھر سے باہر، دونوں دائروں میں اس کی شخصیت شکستہ، دبی اور کچلی ہوئی ہے۔ مردوں کا بنایا ہوا سماج عورت شکنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اس کی ذات کا شیرازہ ابتر ہے۔ وہ سوالیہ نشان ہے۔ وہ اندرونِ خانہ ہو یا بیرونِ خانہ، وہ دوہرے جہنم میں ہے۔ وہ اس دوہرے جہنم کو اُس دوہری جنت سے کیسے بدلے جہاں اُسے نہ کوئی بیرونی خوف ہو نہ کوئی اندرونی افسردگی۔ اور اس طرح

وہ یمن سے مدینہ تک اکیلی بے خطر جا سکے۔

(۰)

افتخار حفیظ (خالدہ مذنیب کا بھائی)
سال دوم کا طالب علم

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

صاحبِ صدر! ابھی میں نے اپنی بہن کی تقریر کو غور سے سنا۔ میری بہن نے عورت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ تصویر

واقعی بڑی دلسوز ہے۔ انہوں نے جو سوال اٹھایا ہے، نہایت اہم ہے۔ انسانی علم، دانش، فلسفہ اور وجدان اس کا جواب دینے سے قاصر رہے ہیں۔ لیکن اس آسمان کے نیچے ایک مقام ایسا ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اور حتمی طور پر کہتا ہے کہ آؤ میرے پاس تمہاری اندرونی افسردگیوں اور بیرونی خطرات کا پائیدار حل ہے۔ میرے یہ قوانین بھی اسی طرح اٹل اور نتیجہ خیز ہیں جس طرح مادی دنیا میں طبیعیاتی قوانین۔ یہ گوشہ وحیٔ خدا قرآن مجید ہے۔ آؤ قرآن سے پوچھیں وہ میری بہن کو کیا پیغام دیتا ہے۔

قرآن کا اعلان ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومہ حیات سے پیدا کیا اور اس جرثومہ حیات کو (دو حصوں میں تقسیم کر کے) جوڑا بنایا۔ ان کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ گویا مرد اور عورت کا سرچشمۂ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی شاخ ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے دونوں تکریم کے مستحق ہیں۔ انسانیت کی تمام صلاحیتیں مردوں اور عورتوں دونوں میں موجود ہیں۔ دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے۔ دونوں میں یکساں طور پر قانون کی پابندی اور قانون شکنی کی صلاحیت ہے۔ دونوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ عورت اور مرد اپنی اپنی کمائی کے مالک ہوتے ہیں۔ دیکھیں سورۂ احزاب میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ اگر مرد اس جماعت کے رُکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رُکن ہو سکتی ہیں۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اس کا استعمال قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے۔ اگر مرد اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ثابت قدم رہ سکتی ہیں۔ اگر مردوں میں یہ خصوصیت ہے کہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا قابو رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ اگر مرد جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو سمجھنے اور ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے۔ جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ اس واسطے نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم ہے۔ دوسری جگہ سیر کرنے والے اور سیر کرنے والیاں کہا ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتی ہے اور منکر کو روکتی ہے۔ اس فریضہ میں عورتوں کو حصہ دار بنایا گیا ہے۔ گویا مرد اور عورت میں قانوناً، اصلاً اور عملاً مساوات ہے۔

قرآن نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا زوج کہا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ عورت مرد کی زوجہ ہے۔ زوج اُن کو کہتے ہیں کہ پروگرام کی تکمیل کے لئے دونوں میں سے کسی ایک کی ہستی تنہا کفایت نہ کرے۔ جو دو اس طرح مل کر مقصد کو پورا کریں وہ ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ اس میں ایک کی کمی دوسرے کے تعاون سے پوری ہوتی ہے۔ مرد اپنی تکمیل کے لئے عورت کا محتاج ہے اور عورت اپنی تکمیل کے لئے مرد کی۔ زوجیت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کی کوئی لگی بندھی فطرت نہیں۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر رکھ دی جاتی ہے۔ انسانی بچہ صاف ذہن لے کر پیدا ہوتا ہے اور بطور ممکنات اس کے پاس صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے نہ عورت کی فطرت ٹیڑھی ہے اور نہ مرد کی فطرت سیدھی اور سخت۔

عورت اور مرد کے مقام میں فرق نہیں۔ ان میں تقسیم عمل پایا جاتا ہے۔ بچے کی تربیت اور امت کی تشکیل ماں سے ہوتی ہے۔ اس عظیم ذمہ داری سے نپٹنے کے لئے عورت کی زندگی کا بیشتر حصہ صرف ہو جاتا ہے اس عرصہ میں وہ رزق نہیں کما سکتی۔ اس سے معاشرہ میں ایک کمی پیدا ہوتی ہے۔ اس کمی کو مرد پورا کرتا ہے۔ یعنی عورت ایک جہت سے معاشرہ میں اضافہ کا موجب بنتی ہے اور مرد دوسری جہت سے تعتیم کا۔ فضیلت کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ اس تقسیم عمل کی رُو سے مرد کا میدانِ عمل معمولاً گھر سے باہر ہے اور عورت کا دائرہ عمل معمولاً گھر کے اندر ہے۔ عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اولین فرائض کو انجام دے اور جب ادھر سے اطمینان ہو جائے تو بیشک مردوں کے دوش بدوش جہادِ زندگی کے دوسرے شعبوں میں شریک ہو۔ مرد بھی تو باہر سے آکر بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کی نگہداشت میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ عورت کو گھر میں محبوس کر دیا جاتا ہے۔ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے جو قرآن اُن عورتوں کے لئے تجویز کرتا ہے جن سے بے حیائی کے عنوان ظاہر ہو رہے ہوں

مرد اور عورت کی رفاقت ایک معاہدہ کے تحت قائم ہوتی ہے جسے نکاح کہتے ہیں۔ یہ معاہدہ بالغ مرد اور بالغ عورت برضا و رغبت کرتے ہیں۔ نکاح سے باہر عورت کے لئے تمام مرد اور مرد کے لئے تمام عورتیں حرام ہوتی ہیں۔ عورت کبھی مرد سے بطورِ حق عفت کا تقاضا کر سکتی ہے۔ حفاظتِ عصمت کا حکم دونوں کے لئے یکساں ہے اور کوتاہی کی صورت میں دونوں کی سزا یکساں طور پر سو سو کوڑے ہے۔ باہر نکلیں تو مرد اور عورت دونوں کو حکم ہے اپنی نظریں قابو میں رکھیں۔

قرآن کا قانون ایک مرد اور ایک بیوی کا ہے۔ ہنگامی حالات میں وسعت کے طور پر اس میں استثناء ہے لیکن اس کا فیصلہ معاشرہ کرے گا۔ یہ شخصی فیصلہ نہیں ہوگا۔ نکاح کے معاہدہ کو فسخ کرنے کا ایک متعین طریقہ

ہے۔ طلاق کا فیصلہ معاشرتی نظام کرے گا۔ اختلافی امور میں مرد اور عورت دونوں کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہے۔

میری بہن نے ملاحظہ فرمایا کہ ان نظریات کے مطابق مرد اور عورت ایک جہانِ نو میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔ آزادی اور پابندی کا اتنا حسین توازن۔ مرد اور عورت کا ایسا انسانیت پرور رابطہ۔ مودت، رحمت اور سکینت بھری زوجیت، جنتی معاشرہ کے سوا کہاں مل سکتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ اس معاشرہ میں یہ دردناک سوال پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ تیرا مسلماں یا تیری مسلمان کدھر جائے؟ ہر کوئی مقامِ محمود کی طرف گامزن ہوگا جہاں بیٹا اور بیٹی کے احترام میں فرق نہیں ہوگا ــــــ سمجھی میری محترم بہن!

(٭)

محمد احمد
ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

جنابِ صدر! اس وقت انسانیت ایک عجیب خلفشار سے دوچار ہے ـــ اقوامِ عالم تہذیب و تمدن کی جلوہ پاشیوں اور سائنسی کمالات سے بہرہ ور بھی ہوئی ہیں۔ چاند ستاروں پر کمندیں بھی ڈالی ہیں۔ ان کامیابیوں پر جشنِ مسرت بھی مناتے ہیں۔ امن و سلامتی کے پیغامات بھی نشر ہوتے ہیں۔ یو۔ این۔ او، اور سلامتی کونسل میں دلفریب تقریروں سے بھی نوازا گیا ہے۔

بھوک اور افلاس کے ڈیرے بھی ہیں، وحشت و بربریت کا طوفان بھی۔ گرتے ہوئے زہریلے بم، جلتی ہوئی آبادیاں۔ اٹھتے ہوئے شعلے، مٹتی ہوئی انسانیت، نوحے، فریادیں اور چیخ و پکار بھی۔

کامیابیاں و کامرانیاں ہیں تو ساتھ ہی ہولناک قسم کی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اپنے پیدا کردہ دامِ فریب کے تاروں میں اقوامِ عالم الجھ کے رہ گئی ہیں۔ ہلاکت سامانیوں سے فرار بچنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ آئے دن نئے نئے اسالیبِ حکومت وضع کئے جا رہے ہیں۔ مگر اس تباہی کے دلدل سے بچنے کی جتنی کوشش ہو رہی ہے اتنے ہی زیادہ گہرائیوں میں اترتے جا رہے ہیں۔ ان اسالیبِ حکومت نے بنی نوعِ انسان کی خوشحالیوں میں اضافہ کرنے کے بجائے خود ملک کے اندر برسرِ پیکار پارٹیوں اور مختلف ملکوں کے درمیان نفرت و رقابت کے جذبات کو جنم دیا ہے۔

بھٹکتی، ٹھوکریں کھاتی انسانیت اس مقام پر آکھڑی ہوتی ہے کہ جمہوریت یا اشتراکیت اس کے دکھوں کا مداوا نہیں۔ یہ نظام انسان کو وحشی اور خونخوار بننے سے روک نہیں سکتے۔ بلکہ اس کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے من مانی

سکاروائیاں کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اطالوی مدبر میزینی کے خیال میں حکومت صرف مستقل اصول و ضوابط کی ہونی چاہیئے اور ایسی حکومت صرف خدا کے قوانین کی حکومت ہوگی۔ خدا کے علاوہ جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ خدا درمیان میں نہ ہو تو اپنے زمانۂ اقتدار میں ہر ایک مستبد بن جاتا ہے۔ یاد رکھئے، جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں ہوگا۔"

مفکرین عالم اس نتیجے پر پہنچ کر حیران و ششدر کھڑے ہیں کہ قوانینِ خداوندی کہاں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔؟ مستقل اقدار کا حصول کہاں سے ممکن ہو سکتا ہے؟ دوسری طرف خدائی قوانین و مستقل اقدار کی حامل کتاب کے نام نہاد وارث اس سوچ میں گم ہیں کہ جمہوریت یا اشتراکیت میں سے کون سا نظام قبول کیا جائے۔

معزز سامعین! آج اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ انسانیت جن قوانین کی تلاش میں ہے وہ قرآن کی بارگاہ سے مل سکتے ہیں تو چاروں طرف سے خندۂ استہزاء کی گونج سنائی دے گی اور ہر لب پر زبانِ حال سے ایک ہی سوال ابھرے گا کہ اگر مسائل زندگی کا حل قرآن میں موجود ہے تو اس کتاب کی حامل قوم کا کوئی بھی مسئلہ کیوں حل نہیں ہو رہا؟ کیوں دنیا بھر کے مسلمان غلامی، محکومی، معاشی بیچارگی اور سیاسی نکبت و زبوں حالی کا شکار ہیں؟ ــــ اس سوال کا جواب آسانی سے یہی دیا جا سکتا تھا کہ مسلمان ہونے کے لئے صرف اتنا کافی سمجھ لیا گیا ہے کہ بچے کے کانوں میں پیدا ہوتے ہی اذان دے دی جاتی ہے یا پھر اس کا نام محمد احمد رکھ دیا جاتا ہے۔ میری سوچ شاید اسی ڈگر پر رہتی مگر سوال سامنے آگیا ہے

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

پہلے تو خیال تھا کہ صرف نام کے مسلمان ہونے کی بنا پر قوانینِ خداوندی کی لاعلمی اور بے علمی وجۂ ذلت و زبوں حالی ہے مگر اب حیرانگی یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس کے ہو گئے ہیں کیا انہیں بھی اپنی منزلِ مقصود کا علم نہیں؟ وہ بھی پوچھ رہے ہیں کہ وہ کدھر جائیں؟ حالانکہ قانونِ خداوندی تو یہ ہے کہ جو اس کا ہو گیا وہ کامیابی و کامرانی کی منزلِ مقصود کو پا گیا۔

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

قانون یہ ہے اور یہاں دعوےٰ ہے اس کے ہونے کا اس حالت میں جب منزل کا علم نہیں اور زبان پر شکوہ یہ ہے۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

لیکن خدا کے اس پیغام کو سنا نہیں کہ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں

اور

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

صدرِ محترم! یہ جملہ معترضہ تھا۔ آج کے زیرِ بحث موضوع کو چھیڑنے سے پیشتر میرے سامنے یہ سوال آیا ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ جواب بڑا مختصر اور بلیغ حقیقت کا آئینہ دار ہے ــــ مسلمان وہ ہے جو خدا کے احکامات کے مطابق فیصلے کرے۔ اور وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۔ اور مسلمان کہلانے کے مستحق وہ ہیں جو اپنا مال، اپنی جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں تاکہ جنت نظیر معاشرے کو قائم کر سکیں۔

خواتین و حضرات! ان حقائق کے پیشِ نظر مسلمان بننے کے لئے تو ضروری ہے کہ ایک آزاد مملکت ہو جس میں خدا کے احکامات کے مطابق فیصلے بھی کئے جا سکیں اور اس مملکت کی حکومت کو جان و مال ہبہ بھی کیا جا سکے۔ علامہ اقبالؒ کی اسی قرآنی بصیرت نے ایک علیحدہ مملکت کا تصور دیا جس کو قائدِ اعظمؒ کی عملی بصیرت نے محسوس شکل عطا کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً واشگاف الفاظ میں اس مملکت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا تھا۔

> "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے اصول و احکام ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخصیت کی اور نہ ادارے کی۔ قرآنِ حکیم کے اصول و احکام ہی ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآن کے اصول و احکام کی حکومت ہے۔" (عثمانیہ یونیورسٹی)

صدرِ گرامی قدر! جس قوم کو مسلمان بنانے کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا تصور عملی پیکر میں بے شمار قربانیوں کے بعد آیا جس کا آئین قرآنِ حکیم کے اصول و احکام ہونے تھے، اس کی ۲۳ سالہ زندگی پر نظر ڈال لیجئے۔ سوچیئے جس مملکت کا حکمران صرف خدا ہونا تھا وہ جمہوریت اور سوشلزم کی بھول بھلیوں میں گم ہے جس میں تفرقہ بازی شرک کے مترادف ہوتی ہے اسی مملکت میں پارٹی بازی اپنے عروج پر ہے جس میں رہنے والی قوم کے افراد کو محبت کا پیکر ہونا چاہیئے تھا، اس مملکت کی فضا مرکھپڑول ہنگامہ آرائی اور دشنام طرازی سے معمور ہے۔ جو مملکت مسلمان بنانے کے لئے معرضِ وجود میں آئی اس میں آج کافر سازی کے ٹکسال چل رہے ہیں ــــ آج ہر کوئی سرگرداں و پریشاں ہے کہ کدھر جائے؟

معزز سامعین! اس جگہ یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر ایسی فضا کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے جواب میں لمبے چوڑے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ بڑی بڑی تقریریں کی جا سکتی ہیں مگر جواب بڑا ہی مختصر ہے کہ ــــ ہم نے پاکستان کی بنیادی اساس کو ہی نہیں سمجھا ــــ یقین مانیئے اگر ہم نے پاکستان کے حصول کے مقصد کو سمجھ لیا ہوتا تو یہ فضا ہرگز پیدا نہ ہوتی جس میں یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوتی کہ ہم کدھر جائیں ــــ تحریکِ پاکستان کو ہی سمجھنا منزلِ مقصود ہے

اور یہی وہ آبِ نشاط انگیز ہے جس نے عرب کی بے آب و گیاہ زمین کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا تھا۔

خواتین و حضرات! مجھے اس امر کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں کہ پاکستان میں صرف ایک ہی تحریک ہے جس نے اس کی اساس کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور وہ ہے طلوع اسلام تحریک ـــ آج کے ذہنی انتشار اور نکبت و زبوں حالی کے دور میں اس تحریک کو سمجھ کر ہی اپنی منزل متعین کی جا سکتی ہے ـــ چونکہ ہماری منزل پاکستان ہے اور پاکستان کی اساس کو یہ تحریک ہی سمجھا سکتی ہے ـــ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ روشناس کرانے کی کوشش کی جائے۔ روشناس کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم قرآنی اقدار کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا کریں۔ ہم اپنے اندر صحیح انقلاب پیدا کر کے دوسروں کے قلب و نگاہ میں تبدیلی کے لئے کوشاں رہیں۔ قلب و نگاہ میں تبدیلی ہی سے قوموں میں انقلاب آیا کرتے ہیں۔ آیئے! پہلے اپنا محاسبہ کرتے ہوئے یہ دیکھیں کہ کیا ہمارے قلب و نگاہ میں تبدیلی آگئی ہے؟ کیا ہم میں قرآنی اقدار کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے؟

صدرِ محترم! یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ ہم میں یہ تبدیلی نہیں آسکی کیونکہ اگر یہ انقلاب ہم میں آجاتا تو آج یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی کہ ہم کدھر جائیں؟ ـــ حقیقت یہ ہے کہ ہم محنت سے جی چراتے ہیں، مشقت سے گھبراتے ہیں۔ ہم نام و نمود چاہتے ہیں۔ استقامت کی ہم میں کمی ہے۔ ہم جد و جہد سے گھبراتے ہیں۔ ہم مفاد خویش کے حصول و تحفظ کی دھن میں جذب رہتے ہیں۔

ساتھیو! میرا مقصد یہاں پر اپنی کمزوریوں کا رونا نہیں رونا بلکہ صرف اتنا کہنا ہے کہ ہمیں صحیح قرآنی اقدار کو متعارف کروانے کے لئے ہمہ تن مصروفِ تگ و تاز ہو جانا چاہیئے ـــ اس کے لئے ہمیں چاہیئے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مشن کو لے کر اٹھیں اور ابر و باراں کی طرح ہر بلند و پست پر چھا جائیں اور اس وقت تک برسیں جب تک ہمیں ہمارا مقصد افق پر نمایاں نظر نہ آجائے۔ شبنم کے پاکیزہ موتیوں اور آسمان کے روشن ستاروں کی طرح اس تحریک کے خدوخال لے کر ہر طرف پھیل جائیں۔ باد بہاراں کی طرح اس چمن کے پتے پتے تک اپنے مقصد کو پہنچا دیں۔ ایثار و قربانی اور جد و جہد کے اتنے پھول کھلائیں جتنے ہمارے جسموں میں خون کے قطرے ـــ! خلوص کی مشعلیں روشن کریں ستاروں پر کمندیں ڈالیں اور اپنے ولولوں کو ہمالہ کی بلندی عطا کر دیں۔ اور اس عزم کا اظہار کریں کہ

اگر دو چار غنچوں کو ہنسی آئی تو کیا آئی؟!
ہم اس گلشن کے ہر غنچے کو خنداں کر کے چھوڑیں گے

آج کے مسلمان کی منزلِ مقصود صرف ایک ہی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود کے اور قرآنی اقدار کو روشناس کرانے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہو جائے۔ اپنی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رزم گاہِ حیات میں بلند اقدار کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ

پیدا کرے۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

معزز سامعین! یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم ان جذبات کے ساتھ میدانِ عمل میں آگئے۔ تو صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کے مستحق بھی ہو سکیں گے اور اپنے کھوئے ہوئے مقام کو بھی پا سکیں گے اور اس طلوعِ سحر کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوں گے جس سے انسانیت ظلمتوں سے چھٹکارا حاصل کر کے سکھ کا سانس لے سکے گی۔

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

(۰)

نوشابہ
(ایم۔اے اکنامکس کی طالبہ)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

صدرِ گرامی قدر، میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو!

اصل موضوع پر اظہارِ خیال سے قبل اس پس منظر کا بھی مختصراً ذکر کر دوں جو میرے آج کے خطاب کا محرک ہوا۔ میرے قابلِ صد احترام بزرگ، مرحوم و مغفور، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اپنی نکتہ رسی اور مرنجاں مرنج طبیعت کے باعث 'طلوعِ اسلام' کے حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔

پچھلی کنونشن پر پہلی مرتبہ مجھے ان کی غور و فکر کی گہرائیوں میں جھانکنے کا اتفاق ہوا اور ان کی پرخلوص دعاؤں کے کیف سے بھی اب تک روح سرشار ہے۔ میں اس پیکرِ جرأت و اخلاص کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کوئی موزوں لائحہ عمل سوچ ہی رہی تھی کہ جولائی کے 'طلوعِ اسلام' میں ان کا مضمون 'طلوعِ اسلام کا سبق' نظر سے گزرا خصوصاً اس کے آخری پیرا 'قرآنی زندگی' کے مطالعہ نے تو بے کل آرزو کی چنگاری کو شعلہ بنا دیا۔

اس پر بے اختیار ہو کر مجھے باباجی سے درخواست کرنا پڑی کہ اب کی کنونشن پر مجھے اسی حقیقت کشا رہنمائی سے جھوٹے اطمینان کی دھجیاں بکھیرنے کی اجازت دی جائے جس کے سراب سے نکلنے کو ہم تیار نہیں۔

باباجی نے اپنی روایتی شفقت و محبت کے سایۂ عاطفت میں مجھے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ "اس دفعہ کنونشن کے مذاکرے کا کچھ ایسا ہی موضوع منتخب کیا گیا ہے" اور یوں مجھے اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرنے کی استطاعت بھر کوشش کا موقع ملا۔ جو میں محترم حکیم صاحب کے مشن کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں انہیں کے نام معنون کرتی ہوں اور یہ بھی واضح کر دوں کہ ایسی سراپا خلوص و محبت شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کی یاد دلوں میں اجاگر رکھنے

کی بہترین صورت یہی ہے کہ فکرِ قرآنی کو عملی پیکروں میں ڈھال کر، تباہی و بربادی کے بھنور میں پھنسی ہوئی قوم کو حرفِ غلط کی طرح مٹنے سے بچانے کی آخری کوشش کی جائے۔

(۰)

آج کا موضوع ذہن میں آتے ہی بے اختیار اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، راہرو منزل ہی نہیں

جب قومیں تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتی ہیں تو انہیں حیات پرور راستوں کی تڑپ سرگرمِ جستجو بھی کر دیتی ہے۔ وہ علم سے آراستہ ہونے کا عزم کرتی ہیں اور تدبر و تفکر سے کام لیتے ہوئے زندگی کی صحیح روش کا سراغ بھی ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ لیکن سراغ لگانے سے ہی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، تاریکیاں یوں نہیں چھٹ جایا کرتیں۔ محض پانی کی موجودگی کا علم پیاس بجھانے کے لئے کافی نہیں جب تک اُسے حاصل کرنے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا جائے۔ گندم کی لہلہاتی بالیاں بھوک سے نجات نہیں دلا سکتیں جب تک ان سے دانے نکلوا کر، پسوا کر اور پکوا کر کھایا نہ جائے۔ کاغذ پر بنائے ہوئے مکان کا نقش ماہر تعمیرات کی تکنیکی قابلیت کا کتنا ہی شاہکار کیوں نہ ہو ہمیں موسموں کے تغیر و تبدل سے محفوظ اور آسائشوں سے ہمکنار کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جب تک حقیقت کا روپ دینے والے ہاتھ اس کے مطابق تعمیر نہیں کر دیتے۔

اسی طرح صحیح روشِ زندگی کا سراغ پا لینے کے بعد اس پر گامزن ہوئے بغیر جنتی زندگی کا تصور محض سراب ہے جو خود فریبی کا محرک ہونے کے علاوہ ہمارے لئے جان لیوا بھی ہوتا ہے۔ ہم سنہری سپنوں میں گم رہنے کے عادی اور زندگی آرام طلبی سے گزارنے پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ فلاح و سعادت کی پُرخار راہ اختیار کرنے کی جرأت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اور جب تلخ اور وحشتناک حقیقتیں سامنے آکر ان خوابوں کا طلسم توڑ دیتی ہیں اور مصائب و آلام کے لامتناہی طوفان چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں تو ہم چیخ اٹھتے ہیں۔ اے بارے الٰہا۔ جگر پاش مشقتوں کا ماحصل یہ سراب! لیکن ہم اس سراب سے چھٹکارا پا نہیں سکتے کہ منزلِ مقصود تک پہنچانے والی راہ سہل انگاری کی راہ نہیں۔ یہ تو ایک دشوار گزار راستہ ہے جو گفتار کی چاشنی سے قطعِ نظر کردار کی سخت کوشی کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن ہماری حالتِ زار یہ ہے کہ

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ ہوش میں کھویا گیا یہ دیوانہ!

سنگلاخ راستوں پر جانبِ منزل رواں دواں رہنے کے لئے خونِ جگر ودیعت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب جا کر بلند پروازیوں اور دھندلے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

لیکن ہم میں خونِ جگر دینے کا جذبہ ہی کہاں! اور کامیاب و کامران زندگی کی خاطر جان دینے کا حوصلہ کب ہے؟ جبھی تو کتاب مبین سینے سے لگائے "پرویز صاحب کی تشریحات سے دل و دماغ روشن کئے اور چودہ سو سال قبل کی تاریخ کے جگمگاتے اوراق ہاتھ میں لئے کھڑے چلا رہے ہیں کہ جائیں تو جائیں کدھر! ایسے میں یہ فریاد اتنی ہی عبث معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی تازہ دم اونٹ پر سوار، نان و نفقہ ہمراہ لئے منزلِ مقصود کا نقشہ ہاتھ میں تھامے بدحواسی میں پکارتا پھرے کہ اس لق و دق صحرا میں کدھر جاؤں! سبحان اللہ!

علامہ اقبالؒ نے روحِ محمدؐ سے جب یہ فریاد کی تھی اس وقت یہ صحرا نورد واقعی زادِ راہ سے محروم تھا۔ نہ اس کے پاس آزادی کا گراں بہا عطیہ تھا نہ قرآنی احکامات کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی سبیل اور نہ آنکھوں میں عظمتِ رفتہ کا عکس کوئی ٹھوس نتیجہ پیدا کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ تب یہ فریاد ضرور کچھ معنی رکھتی تھی۔ اور اب تو روحِ محمدؐ کے طفیل ضروری ساز و سامان پیدا ہونے کی جانب مثبت اقدامات بھی ظہور پذیر ہو گئے ہیں۔ اک نئی سحر طلوع ہوئی ہے جس کے دامن میں آزاد اسلامی مملکتیں ابھری ہیں۔ فکر و بصیرت اور علم و عرفان کی روشنیاں پھیلی ہیں۔ تاریخ کے روشن چہرے پر پڑی ہوئی وقت کی گرد ہٹا دی گئی ہے تاکہ اس کے نقوش ابھر اور نکھر کر سامنے آجائیں اور روحِ محمدؐ نے زبانِ حال سے امتِ مرحومہ کو یہ پیغام دیا ہے کہ اٹھو! اس نئی سحر کی روشنیوں میں اپنی منزل کا سراغ لگا کر اس کے حصول کے لئے کمربستہ ہو جاؤ۔ لیکن ہم جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ اس زادِ راہ کو مالِ غنیمت جان کر رنگ رلیاں مناتے رہے اور جب یہ روشنیاں ایک اور تاریک تر رات کے اندھیروں میں دم توڑنے لگی ہیں تو پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا ہے کہ ہائے کدھر جائیں!

اب جو متاعِ آزادی پر اسرائیل اور بھارت نے پوری ڈھٹائی سے ڈاکہ زنی شروع کر دی ہے، ہماری مفلوج بصیرت بیرونی نظریات کے سیلاب میں بہہ جانے کو ہے۔ ہماری تاریخ کے روشن اوراق بے عملی کے باعث اک جدید افیون کا روپ دھارتے جا رہے ہیں اور "پدرم سلطان بود" کے نشے میں زندگی کے رہے سہے آثار بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں تو ہمارے جگر میں "کدھر جائیں" کی ٹیسیں پھر اٹھنے لگی ہیں۔

بات سیدھی اور صاف ہے کہ جو متاع ہماری دسترس میں ہے اس سے فی الفور پورے خلوص اور تندہی سے استفادہ کریں، مبادا وقت کے ظالم تھپیڑے مہلت کی نازک گھڑی بھی ہم سے چھین لیں۔ یہ متاع قرآن کی تعلیمات ہے جو اس کی راہنمائی میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں، زندگی کی کامرانیاں ان کے قدم چومتی ہیں۔ یہ متاع رسولِ مقبولؐ کی حیاتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کی منور زندگیوں کی داستان ہے جس کا ایک ایک حرف ہمارے لئے ہدایت کا نور لئے ہے۔ تاریخ کے یہ ولولہ انگیز اور روح پرور اوراق افسانہ نگاری کے شاہکار نہیں جن کا مصرف محض تفننِ طبع ہو۔

یہ تو محسوس حقائق، زندۂ جاوید کارنامے اور حق و صداقت کے سرچشمے ہیں۔ لیکن افسوس ہم نے ان سرچشموں کا ادراک دل کی آنکھ سے نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنے کے لئے فراستِ مومنانہ اور جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بدقسمتی سے ہم ان نعمتوں سے محروم ٹھہرے۔

قوم کی موجودہ زبوں حالی کا مداوا صرف ایک ایسے عملی پروگرام میں ہے جو اس کی تمام غفلت، کام چوری اور جمود کو یکسر سینوں سے پاک و صاف کر کے عمل کرنے کا وہ مرفشہ و شانہ جذبہ مسلمانوں میں از سرِنو بیدار کر دے جو کبھی ان کا طرۂ امتیاز تھا آج قوم اعمالِ صالحہ کی اہمیت سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اپنی ہمسایہ قوموں اور طاقتوں کے مقابل بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ قوم جانتی ہے جھوٹ بُری چیز ہے لیکن جھوٹی سازشیں زوروں پر ہیں۔ قوم جانتی ہے غیبت ایک مکروہ فعل ہے مگر وہ اس سے باز نہیں رہ سکتی۔ قوم جانتی ہے ایفائے عہد ایک مبارک عمل ہے لیکن وہ ایسی بےحس ہو چکی ہے کہ اس سے انحراف اس کا معمول بن چکا ہے۔ ستم بالائے ستم کہ نہ اس منافقانہ روش کو تسلیم کرنے کی جرأت باقی رہی ہے نہ محاسبۂ خویش کا احساس۔ ہم میں تو اتنا بھی حوصلہ نہیں کہ جائز تنقید کو صبر و سکون سے سن ہی سکیں۔ زندگی کی غلط روش سے اجتناب تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پھر تجدید کردار اور احیائے اسلام کیسے ہو! متاعِ زیست کے صحیح استعمال سے حیاتِ ابدی کے حصول کے امکانات کہاں سے پیدا ہوں۔

حالانکہ جانسوزی اور جرأتِ رندانہ سے کامرانی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ قرآن کی حرارت سینوں میں موجزن ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ زندگی کی راہیں روشن نہ ہو جائیں۔ پیدائشی مسلمان بننے کی ٹھان لیں تو زندگی کی کایا پلٹ جائے۔ ذلت و مسکنت کی تیرگی چھٹ جائے۔ تباہیوں اور بربادیوں کے طوفان تھم جائیں اور وقت کی ستم ظریفی رُک جائے۔

ہمارے مفکرِ اعظم علامہ اقبالؔ (کہ جن کی فکر نے زندگی کی راہیں منور کر دیں) کی یہ تمنا تھی کہ ان کا نورِ بصیرت عام ہو جائے اور جوانوں کو ان کی آہِ سحر مل جائے۔ مگر معلوم ہوتا ہے — یہ اک مردِ تن آسان تھا، تن آسانوں کے کام آیا۔ آہِ سحر تو جوانوں کے ہاتھ نہ آئی البتہ آہیں بھر بھر کر زندگی کی حرارتوں کو مایوسی کی افسردگی میں بدلنا انہوں نے ضرور سیکھ لیا۔ نورِ بصیرت کے چشمے بہنے نہیں ندیاں اور دریا بہہ نکلے ہیں لیکن حالات کے دگرگوں ہونے کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ نورِ بصیرت کردار کی عظمتوں میں نہیں ڈھل سکا۔ فکر کی روشنی عمل کی ولولہ انگیزیوں کے لئے مہمیز بننے کی بجائے ذہنی عیاشی کا سامان بن کر رہ گئی ہے۔ یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے مقصودِ حیات کی تکمیل کی بجائے صوفوں پر بیٹھ کر تنقید برائے تنقید کی تباہ کن روش اختیار کر لی گئی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے بڑی جامعیت سے اس حقیقت کو یوں واضح کیا تھا ؎

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغامِ ابھی!

عشق (یعنی ذوقِ عمل) نے قرآن سے سیدھے سادے رہنما اصول اخذ کئے اور ان پر چل نکلا۔ عقل اسی مخمصے میں گرفتار ہے کہ قرآن کے الفاظ حادث ہیں یا قدیم۔ مگر موجودہ نازک گھڑی متنازعہ فیہ مسائل پر طولانی اور دور از کار مباحث میں الجھنے کی نہیں جن کی بدولت مختلف الخیال طبقوں میں بٹ کر اور عملی قوت سے محروم ہو کر قوم کی سرگرمیاں محض زبانی اور قولی اعتقاد تک محدود ہو گئی ہیں۔ بلکہ یہ آزمائش کا لمحہ تو شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنے کا ہے۔ گفتار کی چاشنی سے دامن جھٹک کر کردار کی تلخی سے سینہ سپر ہونے کا ہے۔

صدرِ اول میں قرآن کی زندہ تفسیر اس کی ہدایات پر عمل تھا۔ آج بھی قوم کا درد رکھنے والے ہر شخص کا اولین فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے زیرِ اثر حلقۂ احباب کو فقرے، بیٹھے اور پیٹے عمل پر ابھارتا ہے جس کی واحد اور مؤثر صورت ذاتی مثال سے عملی رہنمائی مہیا کرنے میں پنہاں ہے۔ قوم کو کہنے اور سمجھانے کا ماحصل، جانچنے کا معیار اس میں اٹھنے اور کرنے کا جنون پیدا کرنے میں مضمر ہے۔ یہی منزلِ مقصود حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

عقل بلا عمل تو بیٹھی سوچتی ہی رہتی ہے اور سوچتے سوچتے سو بھی جاتی ہے۔ زمانہ بڑھ کر قیامت کی چال چل جاتا ہے لیکن وہ خوابیدہ جوں کی توں پڑی رہ جاتی ہے۔ اس کے دامن میں محض بلندیٔ افکار پیدا ہو سکتی ہے اور جدّتِ کردار تو جذبۂ عشق کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ قوموں کی بقا کا انحصار گفتار سے آگے کردار کی کرشمہ سازیوں پر ہوتا ہے۔ گفتار کا دائرۂ عمل روشن اور تابناک منزلوں کی جھلک دکھا کر ذوقِ عمل کو بیدار کرنا ہے۔ مگر ان کے حصول کا کام کردار ہی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ عظمتِ کردار ہی پیدا نہ ہو سکے تو صرف ان منزلوں کی جھلکیاں دیکھ دیکھ کر مسحور ہوتے رہنا جو کبھی ہمارا مقدر نہیں بن سکتیں سراسر خود فریبی بلکہ ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس سے فیضیاب ہونے کی واحد صورت اس ایمان افروز روایت کو ہر دم پیشِ نظر رکھنے میں ہے کہ گڑ کھا کر بچے کو گڑ کھانے سے باز رہنے کی ہدایت کرنے سے اجتناب کیوں ضروری سمجھا گیا تھا۔ نورِ بصیرت جب تک عملی پیکروں میں نہیں ڈھلتا، فلاح و سعادت کا باعث نہیں بنتا اور اس مقصد کے لئے دقیق بحثیں درکار نہیں، صرف معمولاتِ زندگی کو بتدریج اس رنگ میں ڈھالتے چلے جانے کی ضرورت ہے۔

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

سادہ زندگی بسر کرنا، اپنے اعزہ و اقربا کے مابین انصاف اور حق پسندی کا رویہ اختیار کرنا، اپنے فرائض کو تندہی سے انجام دینا، دوست و احباب کے ساتھ راستبازی کا معاملہ رکھنا، سماجی تعلقات میں اخلاق اور رواداری کا ثبوت دینا، وغیرہ ایسے سیدھے سادے شعائرِ اسلام ہیں جن کی سرانجام دہی ایک صاف ستھرے اور صحت مند معاشرہ کی بنیاد بن سکتی ہے۔ آخر ان پر عملدرآمد میں کیا شے مانع ہے اور کیوں؟ ان بنیادی اخلاقی اقدار کی پابندی کئے بغیر ہم مسلمان کہلانے

کی جسارت کیونکر کر سکتے ہیں؟ قرآن سے اپنا رشتہ جوڑنے والی قوم میں قول و فعل کا یہ لرزہ خیز تضاد ہی قوم کی تباہی کا اصل سبب ہے۔ ہم سب جو ایک ہی مشترک فکر کے داعی اور مستقل اقدار کی عظمت و سربلندی کے متمنی ہیں، باہم ان اصولوں کی پیروی کے پابند کیوں نہیں ہو سکتے؟ اگر رائی برابر بھی ایمان کی تڑپ موجود ہو تو اس اقدام میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیئے۔ بس یہ عزمِ صمیم درکار ہے کہ ہم باہمی معاملات میں اس صالح روش سے نہ خود ہٹیں گے اور نہ ہی اپنے رفقاء کو ہٹنے دیں گے۔ صرف خود عاید کردہ پابندیاں جو محدود معاشرے کے اخلاقی دباؤ سے آزاد نہ ہوں، کامیابی کی واحد کلید ہیں۔ ہر وہ بات، جو طلوعِ اسلام کے اسٹیج سے پوری سنجیدگی سے پیش کی جائے سننے والوں کے ذہن نشین ہو جانی چاہیئے۔ اگر کانوں میں پڑے ہوئے الفاظ عمل کا روپ نہ دھار سکے تو وہ دیگر ہم مسلک احباب کے شدید محاسبہ کی زد میں ہوں گے۔ سنو اور اس پر عمل کرو، یہی فکرِ قرآنی کا اعجاز ہے جو ہر برائی اور مصیبت کا تیر بہدف علاج ہے۔ عمل اور صرف عمل ہی تمام فکری کاوشوں کا ماحصل ہونا چاہیئے۔

ان چند ٹمٹماتی شمعوں کی روشنی، گھٹا ٹوپ اندھیروں کو چھانٹنے کی جدوجہد میں قریب قریب ختم ہوتی جا رہی ہیں اور نئے چراغ اس لئے روشن نہیں ہو رہے کہ نوجوانوں کا ایک کثیر طبقہ ان ٹمٹماتے چراغوں سے حرارت قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا ہے اور شاید یہ جامد و بار ضمیروں کے ہیچکیر، کاروانِ ملت کے راہبر بننے کی بجائے امتِ مرحومہ کے تابوت میں آخری کیل بننا چاہتے ہیں جو اس محشر کی گھڑی میں بھی قرآن پاک کی پیش کردہ واضح راہِ عمل پہ چلنے کے لئے تیار نہیں جب کہ مکافاتِ عمل کا فیصلہ کن لمحہ سر پر آن کھڑا ہے اور عتابِ الٰہی کا لرزہ خیز طوفان اٹھ رہا ہے کہ ان مردانِ حُر کے نقوشِ پا کو بھی ہمیشہ کے لئے مٹا دے جو ان راست راہوں کی مسلسل نشاندہی کرتے آئے ہیں اور جن پر چلنے کی توفیق ہمیں آج ۳۰ برس بعد بھی نصیب نہیں ہوئی تاکہ اس قوم کو آخری انجام تک پہنچا دے۔ جو راہِ مستقیم سے آگاہ ہونے کے باوجود اس پر چلنے سے منحرف ہے۔ عمل کی بجائے تصورات پر تکیہ کئے ہوئے ہے۔ کلمہ و لا حول پڑھ پڑھ کر جنت کی حقدار بنتی ہے۔ قرآن مجید کا ایک ایک حرف پڑھ کر دس دس منتظر رہتی ہے اور جو بدبخت عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہوئے بھی خود کو عذاب سے مستثنیٰ سمجھنے کی خود فریبی میں مبتلا ہے۔

اب مہلت کے لمحات قریب الختم ہیں اور مجھے ان محرومینِ ہستی کردار اور فکرِ قرآنی کے حصول کو مقصود بالذات سمجھنے والوں کے حضور صرف یہی عرض کرنا ہے کہ وہ انفرادی اصلاحِ نفس اور اجتماعی بہبود کے لئے ایمان کا ناقابلِ عفو و درگزر تقاضا محسوس کرتے ہوئے خود عاید کردہ پابندیوں کے تحت مستقل مزاجی سے عمل اور صرف عمل کی راہ پہ گامزن ہونے کا عزم کرنے کو اب بھی آمادہ نہیں۔ تو وہ وقت آیا چاہتا ہے۔ جب نہ راہیں ہوں گی اور نہ راہوں کا پتہ پوچھنے والے۔ اگر کچھ ہوگا تو صرف مکافاتِ عمل کا محشرستان! اور نفسا نفسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

شاھد امین حیدر
(بی اے بیسی سال اول)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

میرے محترم باباجی! صاحبِ صدر و سامعینِ کرام،

تحریکِ طلوعِ اسلام کا نقطۂ ماسکہ اور وجۂ امتیاز یہ ہے کہ اس تحریک کے نزدیک ہر عمل کی کسوٹی قرآنِ کریم ہے۔

ہر سال طلوعِ اسلام کنونشن کی اس مجلس مذاکرہ میں بصیرتِ قرآنی کے اصول کے تحت نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں اور عملی مسائل کا قابلِ عمل حل بتا کر اس اصول کی قوتِ عمل کو بروئے عقل تسلیم کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ نوجوان ذہن صحیح رہنمائی کے فقدان کی وجہ سے انتشار کا شکار ہے۔ ہمارے معاشرہ کا غلط نظام اسے ایسے مقام پر لے آیا ہے کہ وہ دوراہے کے بجائے بے شمار راستوں کے سنگھم پر حیران و پریشان کھڑا ہے۔ وجہ اس کی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہر راہنما کی اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ اور ہر راہنما صرف اپنے راگ کو صحیح ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں آج کا موضوع سامنے آتا ہے۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

اس موضوع کے تحت نوجوان مسلم کو تدبر کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ قرآنی بصیرت کی روشنی میں آج کے مسائل کا حل تلاش کرے۔ ان مسائل میں زیادہ اہم اور زیادہ ہمہ گیر، اخلاقی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، نظریاتی، معاشی اور مذہبی مسائل ہیں۔ میں نے اپنے لئے ان میں سے مذہبی مسائل کا انتخاب کیا ہے۔ اسی مسئلہ کی وجہ سے آج ملک میں انتشار و افتراق کی آگ لگی ہوئی ہے۔

نوجوانوں کے اس ذہنی انتشار میں مذہبی پیشوائیت کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ سب سے پہلے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے نوجوانوں کو بے عملی کا سبق ملتا ہے۔ نوجوانوں کو یہ کہہ کر مزاجِ خانقاہی میں پختہ تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا کی طرف بھاگنے والے کتے ہیں۔ مسلمان کا کام آسمانی بادشاہت کا حصول ہے اور آسمانی راحتیں صرف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہیں جو دنیا میں غربت، تنگدستی اور مفلسی کی زندگی بسر کریں۔ غربت دراصل اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ اس امتحان میں بندوں کو ثابت قدم رہنا چاہیئے تاکہ ان کی عاقبت خوشگوار ہو۔ انہیں حوروں کا جھرمٹ اور دودھ کی نہریں ملیں۔ دنیاوی آسائشوں کو یہ مذہبی راہنما ایک دلدل بتاتے ہیں جس میں خدا غربت کے امتحان میں فیل ہونے والوں کو پھنساتا ہے تاکہ ان کے لئے آخرت میں جہنم کا سامان کیا جائے۔

مذہبی پیشوائیت قوم کے قوائے عمل کو زنگ آلود کرنے میں پیش پیش ہے۔ اگر ایک طرف غیر متبدل تقدیر کا عقیدہ وضع کیا جاتا ہے تو دوسری طرف کشادگیٔ رزق کا ذریعہ محنت کے بجائے تعویذ بنایا جاتا ہے ایک تعویذ کو

بازو پر باندھیے اور دوسرے زعفران سے تحریر شدہ تعویذ کو پانی میں جوش دے کر پی لیجیے۔ انشاء اللہ کلامِ الٰہی کی برکت سے رزق میں کشادگی ہوگی۔ عقلِ سلیم رکھنے والا نوجوان سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی کسی مرضِ کہنہ کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ اُس مرض کے زود اثر نسخہ پر عمل کرنے اور اس کے مندرجات کو استعمال کرنے کے بجائے نسخہ کے کاغذ کو غلافوں میں لپیٹ کر برائے برکت رکھ دیا جائے۔ یا کیا یہ طرزِ عمل اُس دیہاتی مریض جیسا نہیں جسے ایک نہایت دانا حکیم نے اُس کے مرض کا نسخہ دیا تھا اور وہ نسخہ کی مندرجہ ادویہ کے بجائے خود نسخہ کے کاغذ کو چیاں لٹکا کر اور جوش دے کر پی گیا تھا۔ کیا فرق صرف اتنا ہی ہے کہ دیہاتی مریض نے لاعلمی میں ایسا کیا تھا اور ہمارے مولانا یا پیر صاحب سب کچھ جانتے بوجھتے وہی کچھ کر رہے ہیں۔ منبرِ رسولؐ پر کھڑے ہونے والے اور اس کے مقابل بالکل معمولی عقل کی اس کشمکش میں نوجوان ذہن پریشان ہے کہ منبرِ رسولؐ کی صدا صحیح ہے یا عقل اور مشاہدہ۔ یہ سب کشمکش نوجوانوں میں اندیشہ و نظر کا فساد پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ اسی داخلی فساد کا پر تو یہ خارجی فساد ہے جو آج ہمارے معاشرہ میں برپا ہے۔

ان احبار یعنی اربابِ شریعت نے نوجوانوں کے ذہن میں کچھ کم تنومیت، انتشار اور بے یقینی پیدا نہیں کی ہوتی کہ اربابِ مذہب کا ایک اور گروہ سامنے آتا ہے۔ یہ گروہ اربابِ طریقت کا ہے جو عرفِ عام میں صوفیاء کہلاتے ہیں۔ اس طبقہ کے نزدیک تو یہ دنیا ہی سرے سے فریب ہے۔ ان کا فلسفہ دنیا تیاگ دینے کا فلسفہ ہے۔ انہیں مادے سے سخت نفرت ہے۔ ان کے ہر عقیدہ اور عمل کی تعبیر غیر مادی ہے۔ روحانیت ان کا خاصہ ہے۔ حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ علم ان کے نزدیک قطعی باطل اور ناقابلِ یقین ہے۔ اربابِ شریعت اگر غربت کی زندگی یعنی مادی دنیا سے کم از کم فائدہ حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں تو یہ اربابِ طریقت ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر مادے ہی کو باطل قرار دیتے ہیں۔ جس نوجوان کی سمجھ میں اربابِ شریعت کا طرزِ عمل نہیں آتا تو وہ اربابِ طریقت کا طرزِ عمل کس طرح سمجھ سکتا ہے جو مادی دنیا میں رہ کر مادے ہی سے نفرت کریں۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں بلکہ دریا میں رہ کر پانی سے بیر۔

ان اربابِ طریقت کے بقول قرآن فہمی عوام الناس اور اربابِ شریعت میں سے کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔ عوام اور اربابِ شریعت صرف قرآن کے ظاہری معانی سمجھ سکتے ہیں۔ مگر صوفیاء کے نزدیک ان ظواہر کی کوئی حقیقت ہی نہیں بلکہ یہ سراسر گمراہی ہے۔ اہلِ تصوف کے نزدیک قرآن کی روح اور مغز اس کے باطنی معنی میں پوشیدہ ہے۔ ظاہری معانی کو یہ ہڈیاں قرار دیتے ہیں جو کہ دنیا دار کتوں کے آگے پھینک دی گئی ہیں۔ یہ فلسفہ مولانا روم کے الفاظ میں ہے

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

اگر اربابِ شریعت قرآنِ کریم کی آیات کو گنڈے تعویزوں کے لئے استعمال کرتے ہیں تو اربابِ طریقت الٰہی آیاتِ قرآنی کو قلب پر چوٹیں لگانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان پیرانِ طریقت کے پاس ٹونے ٹوٹکوں سے بڑھ کر کشف و کرامات ہیں جن کے بعد کسی کو محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس صورتِ حال میں ایک اور گروہ سامنے آتا ہے۔ یہ گروہ دراصل سیاسی مگر بزعمِ خود نیم مذہبی ہوتا ہے۔ اسکی نیم مذہبی روش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شرعی چہرہ بنا کر اپنی جماعت کا نام اسلامی رکھ کر اور اپنے غیر اسلامی سیاسی فلسفہ کی کتابوں کو مذہبی رنگ میں پیش کر کے مذہبی تقدس حاصل کیا جاسکے اور نوجوانوں کے سامنے اپنے غیر منصفانہ اور استحصالی پروگراموں کو خدا اور رسول کے احکامات کہہ کر پیش کیا جاسکے۔ یعنی یہ گروہ خدا اور رسول کے نام پر فساد کرنے والوں کا گروہ ہے۔ ہر دوسرے سیاسی گروہ کی طرح اس گروہ میں بھی بے شمار تضادات موجود ہوتے ہیں لیکن یہ نام نہاد نیم مذہبی گروہ ان میں سے ہر اختلافی مسائل کو عینِ اسلام، فرمودۂ رسولؐ اور منزل من اللہ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ اس طرح خود بدنام ہونے اور نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق مزید شکوک و شبہات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ باقی دنیا کے سامنے بھی اسلام کو تضادات سے بھرپور ظاہر کر کے تضحیکِ دین کا موجب بنتا ہے۔

ان کے تضادات کا یہ حال ہے کہ کبھی جمہوریت ان کے نزدیک غیر اسلامی ہوتی ہے اور کبھی شریعت کا آئین ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے اور ایک جمہوریت پسند کافر ایک غیر جمہوریت پسند مسلمان سے زیادہ قابلِ حمایت ہو جاتا ہے۔ کبھی تو بطور انتخابی امیدوار کھڑا ہونا اور ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح ہونے کی کھلی نشانی ہوتا ہے، اور کبھی سردارانِ گروہ اور ان کے تابعین اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے اور ہو سکے تو خریدنے کے لئے گلی کوچوں کی خاک چھاننے کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کبھی اپنی الگ پارٹی بنانا جائز اور کبھی ناجائز اور ہر دو متضاد اعمال و اقوال اپنے اپنے زمانے میں عین مطابق اسلام اور دین کی ضرورت ہوتے ہیں۔

اب آیئے وسیع تر مسائل کی طرف اور دیکھئے کہ یہاں بھی اس دین فروش طبقہ کا کام فی سبیل اللہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے بعد اگر کوئی نوجوان علیٰ وجہ البصیرت کہے کہ معاشرہ میں ایسا نظام ہونا چاہیئے جیسا کہ ہمارے معاشرہ کے ایک یونٹ یعنی گھر میں ہوتا ہے تو اسے ان اسلام پسندوں کی طرف سے کمیونسٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ نوجوان دیکھتا ہے کہ گھر کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ گھر کا ہر فرد اپنے فرض اور اہلیت کے مطابق کام کرتا ہے اور اس کے بعد گھر میں رزق کی تقسیم ہر فردِ خانہ کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر گھر میں کسی کے ذمے کوئی کام ایسا ہو جس کے نتیجہ میں رزق پیدا نہ ہوتا ہو تو بھی اُسے رزق مہیا کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کا بھائی معذور یا بیمار ہو تو اسے اسلئے بھوکا نہیں مارا جاتا کہ اُس نے محنت نہیں کی۔ بلکہ اُسے باقی افرادِ خانہ سے زیادہ ملتا ہے کیونکہ بیماری کی حالت میں

اُس کی جسمانی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ اگر اس نظام کو گھر سے نکال کر معاشرہ میں بھی لے آیا جائے تو ہمارے سارے معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مگر ارباب مذہب اس سیدھی سادھی دلیل کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں اور جب انہیں ان نوجوانوں کے تدبر کے خلاف کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں ملتی تو آخری ہتھیار کے طور پر کفر کے ڈنڈے کو استعمال کیا جاتا ہے۔

معاشیات میں ایک اہم سوال انفرادی ملکیتوں کا آتا ہے۔ ذرا سے غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کی زمین پر ذاتی ملکیت قائم کرنا صریح دھاندلی ہے۔ اگر ذاتی ملکیتوں کے مختلف ہاتھوں اور پشتوں میں انتقال کے سلسلے کو ذاتی ملکیت کی ابتدا کے زمانے تک پہنچا یا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارے زمانۂ قدیم کے بزرگوں نے دھونس اور دھاندلی سے زمین پر لکیریں کھینچ کر اسے ذاتی ملکیت بنا لیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس دھاندلی یا فراڈ کے نچلی پشتوں میں منتقل ہونے سے اُس فراڈ کو تقدس حاصل ہو جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس عقلی دلیل میں کسی قسم کا سُقم ڈھونڈنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ لیکن مذہبی اور نیم مذہبی پیشوائیت بلا دلیل چلّاتے چلی جاتی ہے کہ "اس سے زیادہ ظالمانہ نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا"۔

اس مخالفت کا مقصد وہی ہوتا ہے جو کہ یہودیوں کے احبار و رہبان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وجہ بیان کی تھی کہ یہ شخص (یعنی حضرت عیسیٰؑ) ہماری عیش و آرام کی روٹی چھین لینا چاہتا ہے۔ (انجیل برنباس)

مذہب اور عقل و مشاہدہ کی اس کشمکش میں انسانی ذہن تا دیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے کئی منطقی نتائج نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نوجوان مذہب اور اربابِ مذہب کی طرف سے پیش کردہ خدا اور رسول سے باغی ہو جاتا ہے۔ ایسے نوجوان کے لئے پہلی اور آخری دلیل رہ جاتی ہے اور وہ مغربی معاشرہ کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں چند بدنصیب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فہم و ذکا کا دامن چھوڑ کر کلی طور پر دو رکعت کے اماموں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور پھر اس قسم کے نوجوانوں کے لئے اہم مسائل یہ رہ جاتے ہیں کہ آیا پاجامہ ٹخنوں سے اونچا ہے یا نہیں۔ اور حالتِ نماز میں ایڑیوں کے درمیان فاصلہ کتنا ہے۔ تیسری قسم ان نوجوانوں کی ہے جو ابھی تک مایوس نہیں ہوئے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ معاشرے کے ان تضادات میں گھر کر خدا سے طالبِ ہدایت ہوتے ہیں کہ

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر!
اب تو ہی بنا تیرا مسلمان کدھر جائے!

اور خدا اسے اپنی کتاب و حکمت کے ذریعے بتاتا ہے کہ وہ کدھر جائے۔ خدا اس انداز سے بتاتا ہے۔ اس کا دین عقل کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پڑ جاتا بلکہ عقل کو اپنے ہمراہ لے کر راہِ عروج پر گامزن ہو جاتا ہے۔ قرآن نے ہر بات کو سمجھنے کا معیار عقلِ انسانی رکھا ہے نہ کہ اندھی عقیدت۔ مومن کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی

کو بھی بلا سوچے سمجھے، اندھا دھند قبول نہیں کرتا۔ پارہ ۲۶ کے رکوع ۷ میں دیکھئے کتنی سخت تاکید ہے۔

"لوگ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر
قفل لگے ہوئے ہیں؟"

اسی آیت کریمہ سے مذہبی اجارہ داری کی بھی جڑ کٹ جاتی ہے۔ آیت میں مخاطب تمام لوگ ہیں نہ کہ ایک طبقہ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ مذہب کا اجارہ دار گروہ اسلام کے نظام اجتماعی میں کس طرح در آیا؟ رسولِ خدا اور خلفائے راشدینؓ کے عہد ہائے زریں میں امت میں حکومت اور مذہبی پیشوائیت کی ثنویت نہیں تھی۔ یہ ثنویت اُس دور کی پیداوار ہے جبکہ خلافتِ راشدہ ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور رفتہ رفتہ سرمایہ داری مسلمان ملکوں میں در آئی۔ اُس زمانے میں ملوکیت اور سرمایہ داری کو اپنے تحفظ، عوام کی توجہ اپنے اعمال بد سے ہٹانے اور اپنے اعمال کو مذہب کے کیموفلاج میں عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے مذہبی پیشوائیت کی ضرورت پیش آئی اور یہ کچھ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح فرعون اور قارون کو اپنے تحفظ کے لئے ایک ہامان پیدا کرنا پڑا تھا۔

ملائیت اور تصوف کے پیدا کردہ مسائل کو قرآن ایک ایک کر کے سلجھاتا چلا جاتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کو باطل نہیں بلکہ برحق پیدا کیا گیا ہے (۲۹/۴۴)، خدا امتحان کے طور پر کسی کو غریب نہیں کرتا اور نہ ہی غربت کو پسند کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے غربت خدا کا عذاب ہے جس میں صرف اُسی کو مبتلا کیا جاتا ہے جو قوانین خداوندی سے روگردانی برتتا ہے (۲۰/۱۲۴)۔ قرآن سے تقدیر کے عقیدہ کی بھی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن کے نزدیک رزق کی فراوانی اور تنگی انسان کے اپنے مکافاتِ عمل سے ہوتی ہے نہ کہ تقدیر، تعویذ، کرامات وغیرہ سے۔ خدا نے ہر انسانی بچے کو یکساں پیدا کیا اور اس کے سامنے امکانات کی ایک دنیا موجود کردی۔ امکانات کی اس دنیا میں جیسا کسی کا عمل ہوگا ویسا ہی نتیجہ ظاہر ہو جائے گا، یا اُس عمل کا اثر خود بخود عامل کی ذات پر مرتب ہو جائے گا۔ اگر یہ اثر یا نتیجۂ عمل منفی ہو تو اسے ایک مثبت عمل ہی کے ذریعے زائل یا مساوی کیا جا سکتا ہے نہ کہ تعویذ گنڈوں کے ذریعے۔ اس کے بعد جہاں تک کرامات کا تعلق ہے تو یہ ایک سائنسی اور کسبی علم ہے جسے ہر شخص کوشش کر کے حاصل کر سکتا ہے خواہ وہ ہندو یوگی ہو یا مسلمان صوفی۔

اربابِ طریقت کے فلسفہ کو بھی قرآن جڑوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ قرآن کے نزدیک علم کے ذرائع حواسِ خمسہ ہیں۔ قرآن کے ظاہری اور باطنی، دو معنی ہونا غلط ہے۔ اس کے معنی وہی ہیں جو عربی زبان کی رُو سے سامنے آتے ہیں باطنی معنی کی موجودگی کتمانِ حق ہے اور ـــــ می نہ ستر و خدائے را!

الہام اور کشف قطعی غیر قرآنی عقائد ہیں۔ ایک طرف تو ہم ختمِ نبوت کے مبنی بر قرآن عقیدہ پر جان دیتے ہیں جس کی رُو سے خدا کی طرف سے براہِ راست راہنمائی ملنی بند ہو چکی ہے۔ لیکن دوسری طرف کشف و الہام کے

تحت خدا سے براہِ راست حصولِ علم کا دعوے کر کے ہم مُہرِ ختمِ نبوت کو توڑتے ہیں۔

قرآن نیم مذہبی گروہ کے تضادات کی بھی جڑ کاٹتا ہے۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں تم کوئی تضاد نہیں پاؤ گے۔ اسلام کے اصولوں کو کبھی "مزاج شناسِ رسولؐ" بن کر زیرِ مصلحت تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ کسی مسئلہ کا صحیح حل صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دو متضاد حل ہو ہی نہیں سکتے۔

اربابِ مذہب ذاتی ملکیت کے متعلق جو الجھاؤ پیدا کرتے ہیں اُسے بھی قرآن بلا پیچیدگی حل کر دیتا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں چند اصول بیان کرتا ہے۔ پہلا اصول قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) کا ہے۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس اصول میں ضرورت کا تعین معاشرہ کرے گا۔ دوسرا اصول سواء للسائلین (۴۱/۱۰) کا ہے۔ مقصد اس کا بھی وہی ہے کہ بقدرِ صلاحیت کام کرنے کے بعد ہر فردِ معاشرہ کو حق حاصل ہے کہ معاشرہ اُسے بقدرِ ضرورت لوازماتِ زندگی مہیا کرے۔ تیسرے اصول کے تحت قرآن عدل و احسان کا نظام جاری کرنے کا حکم دیتا ہے۔ عدل یہ ہے کہ جتنا کام لیا جائے اس کا معاوضہ منصفانہ طریق سے ادا کیا جائے۔ اور احسان یہ ہے کہ اگر محنت کا منصفانہ معاوضہ ملنے کے بعد بھی کسی کی ضروریات میں کمی رہ جائے تو معاشرہ اس کمی کو پورا کرے۔ چوتھے اصول کے تحت قرآن نظامِ ربوٰ کی جڑ کاٹتا ہے۔ سرمایہ کو سرمایہ کے ذریعے، یعنی بلا محنت حاصل کرنا ربوٰ ہے۔ اس نظامِ ربوٰ کی جڑ کٹنا سرمایہ داری کے لئے پیغامِ مرگ ثابت ہوتا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کس طرح اربابِ مذہب کے پیدا کردہ الجھاؤ کو اس حسن کارانہ انداز میں سلجھاتا چلا جاتا ہے، کہ عقلِ سلیم رکھنے والا نوجوان والہانہ حقیقی اسلام کی طرف بڑھتے ہوئے پکار اٹھتا ہے

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اس طرح خدا اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کروا لیتا ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

——— (✻) ———

شوکت پرویز
(متعلم سال دوم)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

صاحبِ صدر و معزز خواتین و حضرات!

فضل مسیح چپکے چپکے اسلام کے متعلق کتابیں پڑھتا رہا اور اس کی تعلیم کی صداقت اس کے دل پر آہستہ آہستہ

اثر کرتی چلی گئی۔ بالآخر وہ ایک دن محلہ کی مسجد میں گیا اور مولوی صاحب کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہو گیا۔ فضل محمود اس کا اسلامی نام رکھا گیا۔ ہر طرف سے مبارکبادیوں کے غلغلے بلند ہوئے۔ بعض محلہ داروں نے شیرینی بھی بانٹی، اور باری باری اس کی دعوت بھی کی۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ مومن اور کافر میں وجہ امتیاز نماز ہے اس لئے تم سب سے پہلے نماز سیکھ لو۔ اس نے نماز سیکھ لی اور اسے باقاعدگی سے پڑھنے لگ گیا۔ وہ دل میں بڑا خوش تھا کہ اب وہ پکا مسلمان بن گیا ہے۔ اتنے میں اس کا تبادلہ گوجرانوالے ہو گیا۔ وہاں جا کر اس نے پہلے ہی دن محلہ کی مسجد میں نماز ادا کی تو کیا دیکھتا ہے کہ سلام پھیرتے ہی نمازی چیخ چیخ کر اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس طرح ہاتھ کھلے چھوڑ کر نماز پڑھنا تم نے کہاں سے سیکھ لی۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہوتی تم کافر کے کافر ہی رہے۔ اس نے مولوی صاحب سے کہا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ مجھے صحیح نماز سکھا دیجئے۔ انہوں نے اسے نماز سکھائی اور اس نے اس کے مطابق نماز پڑھنی شروع کر دی۔ دو ایک مہینے گذرے ہونگے کہ اس کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا۔ وہاں اس نے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھی تو کہرام مچ گیا کہ یہ مردود وہابی کہاں سے آ گیا جو سینے پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہا ہے۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ مسجد کا صحن پلید ہو گیا ہے اسے دھونا ضروری ہے۔ مسجد کا صحن دھویا گیا تو اس نے اپنی داستان سنائی۔ اس پر مولوی صاحب نے اسے نئے سرے سے نماز سکھائی اور کہا کہ ہاتھ زیر ناف باندھا کرتے ہیں۔ اس نے اس نماز کی مشق کر لی تو ایک دن ٹیکسلا کے قریب ایک مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ التحیات میں بیٹھا تھا۔ اس نے "اشہد ان لا الٰہ الا اللہ" پر شہادت کی انگلی اٹھائی تو ساتھ والے نمازی نے بیٹھے بیٹھے اس کی انگلی اس طرح زور سے مروڑ دی کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

بمشکل جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور لاہور کا تبادلہ کرا لیا۔ اس نے اندرون شہر ایک مکان کرایہ پر لیا جس کے ارد گرد مختلف فرقوں کی مسجدیں تھیں۔ وہ اپنی انگلی پر پلستر لگائے بیٹھا تھا کہ ایک مسجد سے آواز بلند ہوئی۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح۔ آؤ نماز کی طرف۔ آؤ کامیابی کی طرف۔ پھر دوسری مسجد سے بھی آواز بلند ہوئی۔ پھر تیسری سے، پھر چوتھی سے۔ اس نے ایک ایک کر کے ان آوازوں کو سنا کہ "آؤ نماز کی طرف" "آؤ کامیابی کی طرف"۔ اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اوپر کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

——— (٭٭٭) ———

مسرت چغتائی

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

(انگریزی نظم کا اردو روا ں ترجمہ)

محترم صدر و عزیزانِ گرامی قدر!

آج کے مذاکرے کا موضوع ہے "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"، اور میں سمجھتی ہوں کہ جن حالات سے ہم آج کل گزر رہے ہیں، ان میں اس سے بہتر اور موزوں تر موضوع مذاکرہ کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اس وقت ہمارے چاروں طرف بددیانتی اور غیر انسانی اطوار نے ایسا گھیرا ڈال رکھا ہے کہ ایک حساس اور باشعور انسان کے لئے جینا محال ہو رہا ہے۔

یہ مصرعہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ زمانے کے ستائے ہوئے انسان نے اپنی پکار کا جواب پانے کے لئے بہت سے دروازوں پر دستک دی، لیکن اسے کہیں سے بھی جواب نہ ملا۔ جب اس طرح ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آئی ہو، تو فطرۃً انسان کی زبان پر یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ اب میں کہاں جاؤں۔ کیا خدا کی اس وسیع اور عریض زمین پر کوئی خطۂ ارض یا کوئی معاشرہ ایسا ہے جہاں صداقت اور صحیح اقدار انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے عملاً کارفرما ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس سوال کے جواب کے لئے ان معاشرتی یا سیاسی تنظیمات کا جائزہ لینا چاہیئے، جن کی طرف انسان اس توقع کے ساتھ لپکتا ہے کہ شاید اسے وہاں عدل، محبت اور امن نصیب ہو جائے۔ آیئے! ہم انسانی زندگی کے اولین مرحلہ ــــ یعنی ایک طفلِ شیر خوار ــــ سے ابتدائے سفر کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ پہلی تنظیم جس میں انسانی بچہ سانس لیتا اور آنکھ کھولتا ہے، خود اس کے گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، ایک اردو روزنامہ میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان نے مختلف سمتوں میں قدم بڑھائے ہیں لیکن ایک ایسا گوشہ بھی ہے جس کی طرف اس نے ہنوز نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اور وہ گوشہ ہے بچے کی نفسیات اور انہی خطوط پر اس کی تربیت۔ ماہرینِ علم النفس ہمیں بتاتے ہیں کہ بچے کے لئے تعلیم کا بہترین زمانہ تین سے پانچ سال کی عمر کا ہوتا ہے۔ یہی وہ مختصر سا عرصہ ہے جس میں بچے کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کی جا سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شئے کی نشوونما کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لئے وہ اسباب اور سامان مہیا کئے جائیں جو اس کی نشوونما کو تقویت دے سکیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے کتنے گھرانے ہیں جنہوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت تک بھی گوارا کی ہو کہ بچے کی نشوونما کی تقویت کے لئے کون سے اسباب و سامان کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پاکستانی بچہ اپنے گھر کے ماحول میں تقویت بخش سامانِ حیات کی بجائے مایوسیاں اور نفسیاتی پیچیدگیاں پاتا ہے۔ یہ بات تو بہت دور کی ہے کہ ہمارے گھروں میں سوالات پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے، وہاں سوال کرنا گستاخی اور اس کا جواب مانگنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بچپن ہی سے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے بغیر ان کے اوپر اتنے بوجھل پتھر رکھ دیئے جاتے ہیں کہ وہ سر ہی نہ اٹھانے پائیں۔ پہلے تو ہمارے ہاں بچے کی پیدائش ہی کسی پلان کے مطابق نہیں ہوتی۔ وہ ایک ناخواندہ مہمان کی طرح اور پھر اس کے بعد اس کی قطعاً کوشش نہیں کی جاتی کہ اس میں سوچنے سمجھنے اور معاملات

کو خود سلجھانے کی صلاحیتیں بیدار ہو جائیں۔

پانچ سال کی عمر کے بعد بچے کو سکول میں بھیجنے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ پاکستان میں ابھی اسّی فیصد بچوں کے لئے ہنوز ابتدائی تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ اور اگر انتظام ہو بھی تو ان کے ماں باپ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ وہ ابتدائی تعلیم کے مصارف بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ عمر بھر کے لئے نوشت و خواند تک سے محروم رہ جاتے ہیں۔ سوچئے، کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے لئے یہ صورتِ حال کسی طرح بھی باعثِ فخر قرار پا سکتی ہے۔ اور پھر ایک مسلمان قوم کے لئے جو اس قرآن پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے جس کی سب سے پہلی نازل شدہ آیت کی ابتداء پڑھنے کی تاکید سے ہوئی ہے۔ یہ حقیقت باعثِ صد تاسف نہیں ہے؟ اور پھر یہ حقیقت عالمگیر تعلیم کے اس تصور کے بھی کس قدر خلاف ہے جو بانیٔ پاکستان کے پیشِ نظر تھا۔

اب اس اقلیت کی طرف آیئے جو اسکول میں داخلہ لے لیتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اچھے اسکولوں میں داخلہ تک بھی اثر و رسوخ یا سفارش (بلکہ بعض اوقات رشوت) کے بغیر مشکل ہوتا ہے۔ پھر ان اسکولوں میں بیشتر کی یہ حالت ہے کہ کہیں تعلیم کے لئے ضروری سامان نہیں، کہیں موزوں اساتذہ نہیں۔ اور پھر جہاں یہ سب کچھ ہو وہاں بھی طالب علم کو اس قابل نہیں بنایا جاتا کہ وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرسکے۔ اس کے ذہن کو سائنٹیفک بنانے کی بجائے توہم پرستیوں کا نشیمن بنا دیا جاتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی بجائے اسے سہارے ڈھونڈنے کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔ اسے حق گو اور بیباک بنانے کی بجائے بزدل اور منافق بنا دیا جاتا ہے۔ اسے صحیح اسلامی زندگی گزارنے کے قابل بنانے کی بجائے مذہبی گورکھ دھندوں میں الجھا دیا جاتا ہے۔ اسلامیات کے پیریڈ میں ہر قسم کی توہم پرستیوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ بچہ بڑا ہو کر نہ کسی معاملہ میں خود کسی فیصلے کے کرنے کے قابل رہتا ہے، نہ ہی اس کی صلاحیتیں سکول سے آگے بڑھ کر کالج اور یونیورسٹی کی طرف آیئے۔ یہاں پھر داخلہ تک کے لئے اثر و رسوخ، سفارشات اور رشوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، یہاں روپے سے ڈگریاں تک خریدی جا سکتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ غریب نہیں کرسکتے، سرمایہ دار طبقہ ہی کرسکتا ہے۔ داخلہ اور ڈگریاں تو اس سفر کے دو کنارے تھے۔ اس کی درمیانی مسافت بھی ہموار اور پُرامن نہیں ہوتی۔ یہاں ایسے اساتذہ سے واسطہ پڑتا ہے جو اس مضمون کے لئے جسے وہ پڑھاتے ہیں موزوں ہی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی موزوں ہوتا ہے تو اس میں نالائق طالب علموں کے لئے ناجائز مراعات اور قابل طلباء کے خلاف جذباتِ حسد اُبھرتے ہیں۔ باقی رہا نصابِ تعلیم، سو یہاں بھی وہی عالم ہے جو سکول کو محیط تھا۔ یہاں بھی طالب علموں کو افلاطون کے افسوں اور طلسمات کی تعلیم تو دی جاتی ہے، تاہم انسانیت، فطرت اور کائنات کی تابناک زندگی کو کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔

اب آیئے دیکھیں کہ ہمارے سیاسی گوشے میں حالات کیا ہیں۔ یہاں تو یوں کہیئے کہ بس تو بہ ہی بھلی۔ دنیا میں کبھی کسی نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کا مزعومہ نصب العین تو ایک ہی ہو، یعنی اسلام کی سربلندی اور دین کا قیام — اور پھر یہ مشترکہ نصب العین رکھنے والے باہمی سرپھٹول میں مصروف ہوں۔ یہ سب آسمان کی باتیں تو کریں گے لیکن زمین پر بسنے والے انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ان کے ذہن میں کچھ بھی نہیں گزرے گا۔ جیتے کہ بین الاقوامی سطح پر بھی دنیا میں کوئی معاشرہ ایسا نہیں ہے جس کے پیشِ نظر انسانیت کی فلاح و بہبود ہو۔ قوموں کے تغلب کی خاطر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ سوچیئے، کہ آج ویٹ نام اور عربی ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ ہر جگہ "جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے" کا "اخلاقی اصول" عملاً کارفرما ہے۔

ان دروازوں کا ستایا ہوا انسان بالآخر اقوامِ متحدہ کے بابِ عالی پر دستک دیتا ہے اور وہاں سے بھی مایوسی کے سوا اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ یہ بلند آہنگ دعاوی رکھنے کا مدعی ادارہ اپنے ظرف میں اتنی کشادگی بھی پیدا نہیں کر سکا کہ چین جیسی وسیع و عریض مملکت کو اپنے ایوان میں ایک نشست دے سکے۔ یہ ابھی تک اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پیدا کر سکا کہ فلسطین اور کشمیر جیسے اہم معاملات کو منصفانہ طور پر حل کر سکے۔ اگلے دنوں جب اہلِ فلسطین چند ہوائی جہازوں کو ہتھکا کر اپنے ہاں لے گئے تھے تو دردمندانِ متحدہ اقوام نے اس وحشت و بربریت کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ اور اس میں انہیں اس وحشت و بربریت کی یاد تک بھی نہیں آئی تھی جو گذشتہ بیس پچیس سال سے فلسطین کے بے گھر، بے در — لیکن ملک کے اصلی مالک — فلسطینیوں پر روا رکھے جا چکے تھے۔

جب ساری دنیا میں ظلم اور استبداد کا اس قدر دور دورہ ہو، تو فرمایئے سینے میں ایک حساس دل رکھنے والا انسان اگر یہ کہے اور کیا کہے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے ؟

میں نے اس نہایت اہم اور نازک سوال پر مدتوں غور کیا ہے اور اس کے بعد میں صرف ایک نتیجہ پر پہنچی ہوں، اور وہ یہ کہ ہماری اجتماعی زندگی قرآن کے اصولوں میں ڈھلنی چاہیئے۔ لیکن اجتماع تو افراد ہی کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ اگر افراد کی زندگی قرآنی قالب میں ڈھلی ہوئی نہیں ہوگی تو اجتماعی زندگی اس قالب میں کیسے ڈھل جائے گی۔ لہذا اس کی ابتدا افراد ہی سے ہوگی۔ یہ افراد جو اس قسم کی چنگاری اپنے دل میں لئے ہوں گے مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے بیگانہ بکھرے پڑے ہوں گے۔ لیکن فکر و نظر کی ہم آہنگی اور دل کی دھڑکنوں کی یکسانیت بکھرے ہوؤں کو ملا ملا کر اس طرح ایک مرکز پر جمع کر دیتی ہیں جس طرح ایک چراغ سینکڑوں پروانوں کو دعوتِ رقص دے دیتا ہے۔ والسلام !

———— (ﷺ) ————

خاور خورشید بٹ
(صدر ایف سی کالج سٹوڈنٹس یونین)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

صدر گرامی قدر، محترم پرویز صاحب، معزز خواتین و حضرات اور عزیز ساتھیو!

آج اس محفل میں جو موضوعِ سخن ہے اُس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہمارے معزز اساتذہ کرام اور طالب علم بھائیوں اور بہنوں نے جس دردمندی اور خلوص سے ملّتِ اسلامیہ کی موجودہ دگرگوں حالتِ زار کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس میں مزید کسی قسم کی نقاشی کرنا مجھ جیسے کوتاہ علم طالب علم کے لئے کسی حد تک ناممکن ہے۔ بہرحال انکے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے میں آپ کے سامنے ذہنی تضادات کی شکار نئی نسل کے دل و دماغ میں ابھرنے والے خیالات و نظریات پیش کروں گا۔ آج دنیا کے ستر کروڑ اور خصوصاً پاکستان کے بارہ کروڑ مسلمان نہایت کربِ اضطراب سے یہ استفسار کر رہے ہیں کہ

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں نے ایک طویل اور کٹھن جدوجہد کے بعد اپنے لئے علیحدہ مملکت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس جدوجہدِ آزادی میں لاکھوں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ انہوں نے اپنا آج ملّتِ اسلامیہ کے درخشندہ کل کے لئے قربان کر دیا۔ مسلمانانِ برصغیر کے سامنے ایک ہی نصب العین تھا اور وہ تھا پاکستان میں ایک مثالی معاشرے کا قیام۔ انہوں نے اس ارضِ پاک میں قانونِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرنے کا ارادہ کیا اور اس عزمِ صمیم کے ساتھ کہ وہ منتشر ملّتِ اسلامیہ کو دوبارہ عہدِ رفتہ کی طرح ایک لڑی میں پرو دیں گے۔

انہوں نے سروں پر کفن باندھ کر جدوجہد کا آغاز کیا اور بالآخر ناممکن کو ممکن بنا کر دنیا کی سب سے بڑی مسلمانوں کی مملکت کی بنا ڈال دی۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک تقریباً ۲۳ سال کے طویل عرصہ میں جس شرمناک طریقے سے قوم کو بے وقوف بنایا گیا وہ ہم سب جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارے بزرگان صاحب حیثیت و اقتدار نے جنگِ آزادی اور دفاعِ پاکستان کی جنگ کے لاکھوں شہیدوں کے نیک مقاصد سے غداری کی۔ اور ان کی آرزوؤں کو نہایت بے دردی سے خاک میں ملا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ملّتِ مرحوم کا شیرازہ اسی دن بکھر گیا تھا جب اندرونی و بیرونی سازشوں نے مسلمانوں کو قرآن کریم کی تعلیمات پر غور و فکر کی عادت سے روگردانی کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہے۔ مسلمانوں

نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ کے تشکیل کردہ نظام معاشرت کو نظر انداز کر دیا اور باہمی اختلافات و افتراق میں کھو کر اپنی تمام تر توانائیاں ضائع کر دیں۔ مسلمانوں میں عقل، سوچ اور فکر و تدبر کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور یہ سب کچھ مذہب پرست اجارہ داروں کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ حضرات! ملت اسلامیہ کی تیرہ سو سال کی تاریخ نہایت تلخ حقائق سے پر ہے۔ اس میں سوائے چند درخشندہ و تابندہ ستاروں کے تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اب اس میں کچھ امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ سالہا سال سے سینوں میں ٹھوکریں کھا کھا کر اب ملت اسلامیہ میں غور و فکر اور تدبر و فراست کے کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقام پر اگر ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا اور صراطِ مستقیم یعنی قرآنِ کریم کے قوانین کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لیا تو امید واثق ہے کہ ملت اسلامیہ اس گرداب سے نکل آئیگی۔ اور اس کا سورج غروب ہونے کے بعد پھر سے طلوع ہو جائے گا۔

حالات بظاہر بڑے مایوس کن نظر آتے ہیں لیکن یاس و ناامیدی کی یہ کیفیت صرف اسی وقت تک ہے جب تک ہم سوچنا شروع نہیں کر دیتے۔ نتیجۃً یاس و ناامیدی کے بادل خود بخود چھٹتے چلے جائیں گے۔ اور امید کی تابندہ شعاعیں ہمارے سینوں کو منور کرنے لگیں گی۔ مگر سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے بزرگ پاکستان کی نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کریں جس پر چل کر وہ دینِ اسلام کی عظمت سے واقف ہوں اور قرآن کے پیش کردہ قوانین کی ابدی سچائی اور حقانیت کے دل سے قائل ہوں۔

زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو کشش ہوگا اسی قدر سعی و کاوشں اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے۔

لیکن افسوس! حالات اس سے یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ نوجوان نسل کو ذہنی تضاد، بے عملی، منافقت، سہل پسندی، تقلید اور فکر و عمل کے تضاد جیسی ضرر رساں خصوصیات اپنے بزرگوں سے وراثت میں مل رہی ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ جب وہ ان خرابیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو اس کو بے دین، انکار پسند، بے راہرو، اور ملحد جیسے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ نوجوان ذہن فرسودہ رسوم و روایات سے مایوس ہو کر اپنے اقتصادی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی ڈھانچے میں مثبت اور خوشگوار تبدیلیاں لاتے چلے جانے کا خواہشمند ہے۔ اس کے

دل میں یہ امنگ موجزن ہے کہ مسلمانوں کو صدیوں پرانی ذلت و رسوائی کی زندگی سے نجات مل سکے وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے ظلم و استحصال کو مزید برداشت کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہیں لیکن جب مذہب پرست طبقہ ان مشکلات کا حل پیش کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو وہ ناچار ان کا حل انسانوں کے وضع کردہ نظاموں میں تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ دین کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت کی انتہائی غلط روش کی وجہ سے نئی نسل اسلام سے بے بہرہ اور بدظن ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے مولوی صاحبان نے جس طریق پر اسلام کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اس سے ان کے دلوں میں اسلام کی حقانیت اور سچائی ثابت ہونے کی بجائے دین سے بیزاری پھیلنے لگی۔ مذہبی پیشوائیت نے جس طرح دینِ اسلام کو دین کی اجتماعی سطح سے گرا کر مذہب کی انفرادی سطح پر پہنچا دیا۔ اور ایک مسلمان اور خدا میں تعلق کے لئے اپنے آپ کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ اس سے وہی صورت پیدا ہو گئی جو سابقہ اہلِ کتاب نے قوانینِ خداوندی سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے مذاہب کی کر لی تھی۔ اسی سلسلہ کی نشاندہی کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

آج جب نوجوان طالب علم اسلام کے مبلغ علمائے کرام کے فکر و عمل میں تضاد دیکھتا ہے تو اس کے دل میں اسلام کے پیش کردہ اصولوں کے خلاف سرکشی کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس کے ذہن میں شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔ آج کرۂ ارض کے بہت سے ملکوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں ہیں اور مسلمان مکمل آزادی سے بزعمِ خویش اسلامی عقاید کے مطابق رسوم و روایات کی پابندی کرتے ہیں۔ انہیں اپنے دین کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کی مکمل آزادی ہے نوجوان جب دیکھتا ہے کہ دنیا کے کروڑوں مسلمان اسلام کے پیروکار ہوتے ہوئے بھی ذلت و رسوائی اور پستیوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، مسلمان آزاد ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ غیر اقوام کے محکوم و زیرِ نگین ہیں، اسلام کے ماننے والے وہ نتائج پیدا نہیں کر رہے جو صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے حاصل کئے اور مختصر سے عرصہ میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں اُن کی حکومت قائم ہو گئی اور انہوں نے وحیٔ خداوندی کے مطابق اپنا نظامِ حیات تشکیل دے کر اُس کے ثمرات حاصل کئے، تو نوجوان سوچتا ہے کہ قرآنِ کریم اب بھی اُسی طرح ہمارے پاس موجود ہے۔ پہلے سے زیادہ تعداد میں مسلمان اس دنیا میں موجود ہیں اور اُن کے پاس وسائل بھی پہلے سے بہت زیادہ ہیں۔ ہر گلی، ہر محلہ میں مولوی صاحب اسلام کی تبلیغ کے لئے موجود ہیں، مگر ان تمام باتوں کے باوجود مسلمان ذلیل و رسوا کیوں ہیں؟

اس کا جواب انہیں کوئی نہیں دیتا۔ مذہبی رہنما الگ مصروف ہیں۔ انہیں ایک دوسرے پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی اور اب تو ان کا بیشتر وقت سیاسی مہرہ بازیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ یاس و نامیدی کا شکار نوجوان

آخر کار یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دینِ اسلام (معاذ اللہ) فرسودہ اور پرانا ہو چکا ہے اور اس میں جدید دور کے مسائل و حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں۔

حاضرینِ گرامی قدر! اگر اس دور میں بھی نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات پر سنجیدگی خلوص اور دردمندی سے غور و فکر نہ کیا گیا اور ان کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب عقل و شعور اور ٹھوس دلائل و براہین سے نہ دیا گیا تو خدشہ ہے کہ نوجوان ذہن بھٹکی ہوئی راہ پر کہیں اس قدر دور نہ نکل جائے جہاں سے واپس لانا شاید ہمارے اسلام پسند رہنماؤں کے بس سے باہر ہو۔

غور طلب امر یہ ہے کہ ہم سنجیدگی سے ان اسباب و علل کا پتہ لگائیں جن کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ جسے قیامت تک کے لئے تمام انسانیت کی بھلائی اور منتشر نوعِ انسانی کو متحد کرنے کے لئے منتخب کیا گیا، آج اس کا اپنا شیرازہ ابتر ہو چکا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے لئے اب بھی موقع ہے کہ وہ اپنی حالت کو خود بہتر بنانے کے لئے کوشش کریں کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی جس نے خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔

ہمیں جلد یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا ہمیں اُس مذہب کی اندھی تقلید کرنی ہے جسے عہدِ رفتہ کے مسلمانوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے پسند کے قالب میں ڈھالا یا یہ وہ دور تھا جب ملوکیت اپنے جبر و استبداد کی بدولت مسلمانوں کے اس معاشرہ پر اپنی گرفت مضبوط کر چکی تھی اور اسی مذہب کو بند آنکھوں سے ہم آج تک قبول کرتے آئے ہیں۔ اس غلط روش کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی۔

اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ۔ (۱۲/۴۰)

بس چند الفاظ ہیں جنہیں یا تو یہ اپنے آباؤ اجداد سے سنتے چلے آ رہے ہیں یا خود وضع کر لئے ہیں۔ ان کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں اور جو مفہوم یہ پیش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملتا نہیں۔

یا ہمیں اُس دینِ اسلام کو غور و فکر اور تدبر و فراست کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرنا ہے جس کا نزول قرآن کریم کی مقدس آیات میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے وحیٔ خداوندی کے ذریعے کیا اور جس میں اختلاف و افتراق کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمانوں کا توحید پر ایمان مسلمان ہونے کی پہلی شرط ہے اور وہ توحید توحید نہیں جس کے ماننے کے بعد آپس میں اختلاف و افتراق رہے۔ توحید کا عملی نتیجہ وحدتِ ملت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے جب کہا۔

وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا

شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۲)

مسلمانو! دیکھنا تم کہیں مومن ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا۔

قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔ (۴/۸۲)

کیا لوگ قرآن پر غور و تدبر نہیں کرتے اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلاف پائے جاتے۔

حاضرین کرام! اتنی واضح اور ٹھوس قرآنی شہادتوں کے ہوتے ہوئے اگر علماء کرام اسلام میں بہتر فرقے کی قانونی حیثیت تسلیم کروانا چاہیں اور ان میں آپس کا جو اختلاف و افتراق اور انتشار ہے اُسے سادہ لوح مسلمانوں سے عین مطابق اسلام منوانا چاہیں تو اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

مسلمانوں کو قرآن کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے اور منتشر ملتِ اسلامیہ کو متحد کرنے کے لیے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری وغیرہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ درحقیقت جب رسول اللہ کے بعد امتِ واحدہ کا شیرازہ بکھر گیا تو مرکزیت ختم ہو گئی اور متعدد فرقے ظہور میں آگئے۔ رفتہ رفتہ خدا کی کتابِ عظیم محض تلاوت بغرضِ حصولِ ثواب باقی رہ گئی اور اسلام دینِ نظامِ حیات کے بجائے مذہب بن گیا۔ انفرادیت، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، رہبانیت، سرمایہ داری سب اسی شجر کے برگ و بار ہیں۔ سابقہ اہلِ کتاب کو اس حالت سے نکالنے کے لیے نبی آجاتا تھا لیکن امتِ مسلمہ کے لئے یہ صورت نہیں ہوگی۔ اس امت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں موجود ہے۔ اس کے لئے کام یہ ہے کہ یہ خدا کی اس کتاب کو وہی مقام دیں جو اس کا حقیقی مقام تھا۔ یعنی معمولاتِ حیات میں اُسے آخری سند و حجت قرار دے دیں اور اس کے مطابق اپنا نظامِ زندگی متشکل کر لیں۔ ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست | زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم | حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ

(ختم)

عارفہ سلطانہ
ایم۔اے فلسفہ (ایم اے اردو)
ریسرچ سکالر "اقبال اور قرآن"

اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے

ایک صبح میں اپنی کالج کے زمانہ کی ہم درس سہیلی راحیلہ کے ہاں بیٹھی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اُردن کے صحراؤں کی آبیاری انسانی خون سے ہو رہی تھی۔ راحیلہ کا گھرانہ قدیم مذہبیت کا گہوارہ تھا اور کالج کے زمانے میں وہ خود ایسی تقدس مآب بنی رہتی تھی کہ ہم سب اُسے ملانی جی کہہ کر چھیڑا کرتی تھیں۔ لیکن جیسا کہ اس افراط اور شدت کا ردِ عمل ہونا چاہیئے تھا' اس کے بعد وہ ایسی رسیاں تڑا کر بھاگی کہ اسے مذہب کے نام تک سے نفرت ہو گئی۔ اُس کی امی جس کی یہ اکلوتی (علیحدہ) بڑی چہیتی بیٹی تھی' اس کی اس تبدیلی سے بڑی افسردہ خاطر رہتی تھی۔ اور اُس کی ہم جولیوں سے بڑی منت سماجت کے ساتھ کہا کرتی تھی کہ کچھ تم ہی اسے سمجھاؤ کہ وہ راہِ راست پر آجائے۔ جیسا کہ ہم سکھیوں کی ملاقات میں اکثر ہوتا ہے ہم نے عمرِ رفتہ کو آواز دے کر بلا لیا' اور ماضی کی سنہری یادوں میں کھوئی ہوئی حال کی ٹھوس حقیقتوں کو کچھ وقت کے لئے فریب دے رہی تھیں کہ اتنے میں اخبار آگیا۔ جس کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں یہ خونچکاں خبر درج تھی کہ یاسر عرفات اور شاہ حسین کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے اور طرفین کے ہزاروں سپاہی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ یہ خبر پڑھتے ہی میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ اس معرکہ میں دونوں طرف مسلمانوں کی فوجیں ہیں۔ اُن مسلمانوں کی جن کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ رحماء بینہم۔ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ اور جنہیں یہ وعید دی گئی تھی کہ جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کر دیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا اور اس پر خدا کا غضب وارد ہو گا۔

راحیلہ نے یہ سن کر ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طنز آمیز شرارت ناچ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ عارفی! اگر سننے کی تاب ہو تو ایک بات کہوں۔ میں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں قرآن کی طالبہ ہوں اور قرآنی تعلیم انسان کے سینے میں اس قدر کشادہ پیدا کر دیتی ہے کہ وہ دوسرے کی بات کو سکون اور متانت سے سن سکتا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم جو کچھ بھی کہو گی اس سے تمہارا مقصد میری دل آزاری نہیں ہو گا۔ دل آزاری تو اس زمانے میں تمہارا مقصود ہوتی تھی جب تم اپنے آپ کو خدا کے مقدس بندوں میں شمار کیا کرتی تھیں۔ اب تم نے کافی ثواب کما لیا ہے۔ اس لئے اب تمہیں کسی کی دل آزاری کی ضرورت نہیں رہی ــــ میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا ــــ اس نے ہسٹری میں ایم۔ اے کیا تھا اور اسلامک ہسٹری سے اسے خاص طور پر

دلچسپی تھی۔ اس نے کہا کہ تم کہنے کو تو یہ کچھ کہہ گئیں لیکن تم نے کچھ سوچا بھی کہ تمہاری بات اُردن کی وادیوں سے نکل کر پہنچ کہاں رہی ہے؟ تم نے غور بھی کیا کہ ــــ ترے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے ــــ مشکل یہ ہے کہ تم لوگوں کی نظری تنقیدیں اور تقریظیں دونوں بڑی بلند آہنگ اور مسحور کن ہوتی ہیں۔ اسے میں حسنِ شاعری کہا کرتی ہوں۔ لیکن حقائق تک تمہاری نگاہ کبھی نہیں پہنچتی۔ تم نے اردن کے مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہہ دیا لیکن اتنا نہ سوچا کہ تمہاری تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔ تم اپنی تاریخ کے اوراق چودہ سو سال پیچھے کی طرف پلٹو اور پہنچ جاؤ اس دور میں جسے تم لوگ اسلام کا صحیح آئیڈیل اور شرفِ انسانیت کی معراجِ اعلیٰ کہہ کر پیش کیا کرتے ہو۔ الٹو ان اوراق کو اور دیکھو کہ ان برگزیدہ ابتائے اسلام کے متعلق تاریخ کیا کہتی ہے۔ تم کہتی ہو کہ قرآن مجید نے ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ آپس میں بہت محبت اور پیار سے رہتے تھے۔ یہ کہتے کہتے وہ اٹھی اور شیلف سے ایک کتاب کھینچ لائی۔ کہنے لگی کہ یہ طبری کی تاریخ ہے جسے اسلام کی مستند ترین تاریخ کہا جاتا ہے۔ مستند ہی نہیں، بلکہ اُمّ التواریخ بھی۔ یعنی اس کے بعد تاریخ کی جتنی کتابیں لکھی گئیں ان کا ماٰخذ طبری کی تاریخ ہے۔ اس میں دیکھو کیا لکھا ہے اور اسے دیکھنے سے پہلے یہ بھی سمجھ لو کہ یہ واقعہ کب کا ہے۔ یہ واقعہ عین اس زمانے کا ہے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور آپ کا جسدِ خاکی ہنوز سپردِ خاک نہیں ہوا تھا۔

اس نے حضورؐ کا اسمِ گرامی جو اس طرح تعظیم و احترام سے لیا تو مجھے سکون نصیب ہوا۔ ورنہ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ مذہب سے اس کی چڑ کہیں اسے اس مقام تک نہ لے گئی ہو جہاں ہمارا نوجوان طبقہ بدتمیز ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ راحیلہ کی کیفیت وہ ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ ــ "قلبِ او مومن دماغش کافر است" ــ راحیلہ کے ذہن نے مذہب سے سرکشی برتی ہے۔ اس کا دل تعصب سے آلودہ نہیں ہوا۔ اس سے مجھے امید بندھی کہ اگر اس کے سامنے اسلام اپنی صحیح شکل میں آگیا تو اس کے قلب کے ساتھ اس کا دماغ بھی مومن بن جائے گا۔ اس سے اس کی امی تو شاید مطمئن نہ ہو، کہ وہ اسلام جس سے اس کا دماغ بھی مومن جائے اس کی امی کے تصور کا اسلام نہیں ہوگا۔ لیکن اس سے راحیلہ کو اس اضطرابِ پیہم سے نجات مل جائے گی جس میں وہ اب اس بُری طرح سے گرفتار ہے۔

راحیلہ نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ وفات پاگئے ہیں اور آپ کے صحابہؓ جن میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل ہیں، مدینہ میں سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں تاکہ خلیفہ کا انتخاب کر لیا جائے۔ اس منصب کے لئے ایک امیدوار حضرت سعدؓ انصار میں سے، اور ایک امیدوار مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ ــ سوچ لو کہ جو حضرات اس وقت اس جگہ جمع تھے، نہ ان سے بڑھ کر مومن کوئی اور ہو سکتا تھا اور نہ ہی ان سے زیادہ رحماءُ بینھم کا مصداق کوئی اور۔ لیکن اس انتخاب میں ہوا کیا، اسے خود طبری کے الفاظ میں سنو۔ اس کے بعد اس نے

طبری سے ان تقاریر کو پڑھ کر سنایا جو ان امیدواروں کے حامیوں نے وہاں کی تھیں۔ انصار میں سے حضرت حبابؓ کی تقریر اور مہاجرین میں سے حضرت عمرؓ کی۔ ان تقاریر کا انداز ایسا ہی تھا جیسا آج کل عام طور پر الیکشن کیمپین میں ہوتا ہے۔ انتخاب میں حضرت ابوبکرؓ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس نے اسے ذرا زور دے کر سنایا - اور وہ یہ تھا۔

"اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر (حضرت) ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ (حضرت) سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ، ان کو نہ روندو۔ (حضرت) عمرؓ نے کہا۔ اللہ اسے ہلاک کرے۔ اس کو قتل کر دو۔ اور خود اس کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑ دو۔ اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہیں رہے گا ۔۔۔۔۔۔ سعدؓ نے کہا کہ اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو میں مدینے کے تمام گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے ۔۔۔۔۔۔ چند دنوں کے بعد انہیں کہلا کر بھیجا گیا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے (حضرت) ابوبکرؓ کی بیعت کر لی ہے، تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر لوں، اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں، اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے، وار نہ کر لوں۔ اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کو ساتھ لے کر جو میرا ساتھ دیں، تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔"

راحیلہ، طبری سے عبارت پڑھتی جا رہی تھی اور مجھ سے پوچھتی جا رہی تھی کہ سن رہی ہو۔ اور میں جواب میں کہتی تھی کہ ہاں! سن رہی ہوں۔ تم پڑھتی جاؤ۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ بہت اچھا۔ اور سنو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ

"انتخاب کے موقع پر حباب نے کھڑے ہو کر تلوار نکالی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی۔ عمرؓ نے اسے اٹھا لیا۔ اور پھر سعدؓ پر جھپٹے۔ اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اس پر کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا۔ اللہ اس کو ہلاک کرے وہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور اس کی زد سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔"

راحیلہ، فاتحانہ انداز سے اقتباس پر اقتباس پڑھتی جا رہی تھی اور میں نہایت اطمینان سے سنتی جا رہی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ یہ باتیں میرے لئے کچھ نئی نہیں تھیں۔ میں نے یہ سب کچھ پڑھ رکھا تھا اور دوسرے اس لئے کہ

میں اس موقعہ کو غنیمت سمجھ رہی تھی کہ میں صحیح بات اس کے ذہن نشین کرا سکوں۔ اس نے پانی کا گلاس پیا اور پھر کہا کہ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کے بعد انصار اور مہاجرین میں سے کچھ لوگ حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادہ سے حضرت فاطمہؓ کے گھر میں جمع ہوئے۔ ان میں خالدؓ بن سعد بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ "اللہ کی قسم رسولِ خداؐ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر کوئی اور نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کریجئے"۔ جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈھ بھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا کہ یا تو تم میرے گھر سے باہر نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔ حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سنکر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور آپ کے ساتھیوں سے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا مطالبہ کیا تو حضرت زبیرؓ بن عوام تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ زبیرؓ کو پکڑ لو۔ اور لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی"۔

اتنا پڑھنے کے بعد وہ پھر رکی اور ذرا غصے میں آ کر مجھ سے کہا کہ دیکھ رہی ہو "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کی عملی تفسیر؟ اور ملاحظہ کر رہی ہو اس بلند آہنگ دعویٰ کی شہادت کہ سب سے پہلے اسلام نے دنیا کو جمہوریت کا سبق سکھایا تھا؟

میں نے جواب میں اتنا کہا کہ تم نے جو کچھ سنانا تھا سنا چکی ہو یا ابھی کچھ اور باقی ہے۔ وہ ذرا تمسخر آمیز انداز سا کہنے لگی کہ ابھی تو ––– ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا – آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ––– یہ تو صدرِ اوّل کے مثالی مسلمانوں کا پہلا انتخاب تھا۔ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور انہیں اپنی وفات کا یقین ہو گیا تو انہوں نے خلیفہ کا انتخاب کرنے کے لئے ایک پینل (PANEL) مقرر کر دیا۔ اس میں کیا ہوا؟ ذرا اسے بھی دیکھ لو۔ یہ کہہ کر اس نے ایک رسالہ اٹھایا اور کہا کہ یہ ندوۃ المصنفین (دہلی) کا ماہنامہ برھان ہے۔ اور یہ پرچہ ستمبر ۱۹۷۰ء کا ہے۔ اس میں ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب کا ایک مقالہ ہے ––– عہدِ عثمانی کا اقتصادی جائزہ ––– اس میں انہوں نے شرح نہج البلاغت۔ طبری۔ اور انساب الاشراف کے حوالوں سے لکھا ہے کہ اس پلان کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے اپنے چچا عباسؓ اور دوسرے ہاشمی بزرگوں سے شکایت کی کہ (حضرت) عمر فاروقؓ نے ایسا پلان بنایا ہے کہ اس بار بھی خلافت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اور پھر کہا کہ

بخدا اگر عمرؓ جیتے رہے تو میں بتاؤں گا جیسی انہوں نے ہماری حق تلفی کی ہے اور اب اور پہلے

جیسی جیسی ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کرتے رہے ہیں۔ اور اگر وہ مر گئے جیسا کہ پورے آثار ہیں تو پینل کے باقی رکن یقیناً خلافت سے ہمیں محروم کر دینگے۔ اور اگر انہوں نے ایسا کیا ـــ اور وہ یقیناً ایسا ہی کرینگے، ـــ تو میں بھی ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔

آخری الفاظ پر اس نے ذرا زیادہ زور دیا۔ اتنے میں اس کی امی نے اندر سے چائے بھیج دی، تو میں نے کہا کہ تمہاری بات ختم ہو گئی یا ابھی باقی ہے۔ کہنے لگی کہ ابھی اس مقام تک تو میں پہنچی ہی نہیں جہاں سے تم نے بات شروع کی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ یا سر عرفات اور شاہ حسین کی فوجیں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں، حالانکہ قرآن مجید نے مسلمانوں سے خاص طور پر کہا تھا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو ارادۃً قتل کر دے وہ سیدھا جہنم میں جاتا ہے اور اس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ ابھی مجھے اس مقام تک آنا ہے کہ اس باب میں تمہاری تاریخ کیا کہتی ہے۔ پہلے چائے پی لیں پھر آگے بات کرونگی۔

میں نے بھی چائے پینی شروع کر دی اور اس دوران میں اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ اِدھر اُدھر کی اور باتیں کرتی رہی۔ اس نے ابھی چائے کی پیالی ختم بھی نہیں کی تھی کہ پھر اس موضوع کی طرف آگئی۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ ایک مدت سے بھری بیٹھی تھی اور اب جو اسے موقع ہاتھ آیا تو جو کچھ سینے میں اُبل رہا تھا، اس سب کو انڈیل دینا چاہتی تھی۔ وہ جو عام شکایت ہے کہ عورتیں بولتی بہت ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں انہیں بولنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ وہ ہر کہنے والی بات کو اپنے سینے کے گراموفون ریکارڈ میں ضبط کئے رہتی ہیں اور اور جب کبھی اس پر سوئی رکھنے کا موقع آتا ہے تو اقبال کی اس نصیحت کے مطابق کہ ؎

برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

وہ پورا ریکارڈ ایک ہی نشست میں سنا دیتی ہیں۔ اور اس میں بھی اکثر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ؎

کہہ گئے لاکھ اُن سے افسانے
پھر بھی کہنے کی بات باقی ہے

ہاں تو اجیلہ نے پھر سررشتۂ سخن تھامتے ہوئے کہا کہ اب اگلی کڑی سنو۔ مملکتِ اسلامیہ کے دارالسلطنت مدینہ کا واقعہ ہے۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہیں ـــ وہ خلیفہ جن کا شمار خلفائے راشدین میں ہوتا ہے، انہیں دن دہاڑے شہید کر دیا گیا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ شہید کرنے والے کون تھے؟ یہ سب خیر سے مسلمان تھے۔ اس کے بعد آپ کے امیرالمومنین کی لاش تین دن تک بے گور و کفن پڑی رہی ـــ سن رہی ہو؟ میں نے کہا۔ ہاں، سن رہی ہوں۔

اس نے کہا کہ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ معرکہ پیش آیا جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں یوں سمجھو کہ پورے کے پورے صحابہ ؓ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا تھے۔ اس میں وہ جلیل القدر اصحاب بھی تھے جو عشرہ مبشرہ کے زمرہ میں داخل تھے۔ یعنی جن کی مغفرت کی خوشخبری خود رسول اللہ نے ان کی زندگی میں دے دی تھی۔ ذرا تصور میں لاؤ اس منظر کو کہ تقریباً پچاس ہزار صدر اول کے مومنین ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں جن میں سے قریباً دس ہزار میدانِ جنگ میں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کے ایک ہی سال بعد یہی مومنین صفین کے میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل شمشیر بکف کھڑے ہو گئے۔ اس جنگ میں ستر ہزار مسلمانوں کے گلے ایک دوسرے کی تلواروں سے کٹ گئے۔

آخری الفاظ اس نے ٹھہر ٹھہر کر لیکن زور دے دے کر پڑھے۔ اس کے بعد کتاب اور آنکھیں دونوں بند کر کے ہتھیلی پر سر رکھ کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے کچھ سوچ میں پڑی ہو۔ چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد اس نے بیٹھے بیٹھے ہلکی سی آواز میں کہا کہ ہاں عارفی! اگر ہمت ہے تو اب وہ آیت پڑھو جس میں کہا گیا ہے کہ جس مسلمان نے کسی ایک مسلمان کو بھی دانستہ قتل کر دیا وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ تم نے اس آیت کو قرآن میں پڑھا ہوگا۔ جن مسلمانوں کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے یہ آیت ان کے سامنے نازل ہوئی تھی۔ اور انہوں نے اسے اپنے رسول کی زبانی سنا تھا۔ عارفی! جس قوم کی تاریخ کی ابتداء اس قدر خونچکاں ہو وہ اردن کے میدان میں مسلمان کے لہو کی ارزانی پر تعجب کس طرح کر سکتی ہے؟ دیکھو عارفی! — اب وہ پھر کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری پرورش اور تربیت ایک انتہائی قدامت پسند مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ کالج کے زمانے تک تم لوگ مجھے "ملانی" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے اور میں اس پر فخر کیا کرتی تھی۔ اور اب تمہیں اس کا علم ہے — اور امی کی سسکیاں تمہارے اس علم کی تصدیق کرتی ہیں — کہ میں مذہب سے بیگانہ ہی نہیں برگشتہ ہو چکی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ میں نے قرآن مجید کا مطالعہ ان تفسیروں کی رو سے کیا جو ابا جان کی الماری میں دھری رہتی ہیں۔ مجھے ان میں کسی علم و بصیرت کی جھلک نظر نہ آئی۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا کہ یہ اُن لوگوں کے "ذاتی خیالات" ہیں جنہوں نے یہ تفاسیر لکھی ہیں۔ اس لئے ان سے مذہب کی صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر میں نے فقہ کا مطالعہ کیا تو تمہیں بتا نہیں سکتی کہ اس میں کیا کچھ دیکھا۔ میں وہاں سے بھی یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی کہ یہ اُس زمانے کے فوانین ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس ماحول کا تقاضا ایسا ہی ہو۔ مذہب اس سے بھی متاثر کیوں ہو۔ لیکن جب میں نے مسلمانوں کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا تو میں کسی طرح بھی اپنے آپ کو فریب نہ دے سکی۔ اس لئے کہ تاریخ کسی کے ذاتی خیالات کا آئینہ نہیں ہوتی۔ وہ تو ٹھوس واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مثلاً طبری نے جو کچھ سقیفہ بنی ساعدہ، شہادت حضرت عثمانؓ، یا "جنگ جمل" اور "صفین" کے متعلق لکھا

ہے وہ اس کے ذاتی خیالات نہیں۔ وہ واقعات ہیں جو اُس زمانے میں سامنے آتے اور مؤرخ نے انہیں کتاب میں منضبط کر دیا۔ اب اس تاریخ کی رُو سے جو نقشہ سامنے آتا ہے، اس سے انسان اس کے سوا اور کس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ جس تعلیم کا عملی اثر یہ ہو اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے چلے جانا کہ اس سے انسانی سیرت و کردار معراج کبریٰ تک پہنچ جائیں گے، کم از کم میرے بس کی بات تو نہیں۔ میں اپنے آپ کو اتنے بڑے فریب میں مبتلا نہیں رکھ سکتی ـــ یہ ہے عارف! مذہب سے میری برگشتگی کی وہ علت جسے کوئی دلیل دور نہیں کر سکتی۔ دلیلیں منطق میں چلا کرتی ہیں، تاریخ میں نہیں۔ تاریخ تو ماضی کے ٹھوس واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے، جو بعد میں بدلے نہیں جا سکتے۔ تبدیلی خیالات میں آ سکتی ہے واقعات میں نہیں ـــ یہ کہہ کر اس نے پھر کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹیک لیا۔

میں نے چائے کا ایک اور پیالہ بنایا اور یہ کہہ کر آگے بڑھایا کہ اسے پی لو تم تھک سی گئی ہو۔ جب اس کے خیالات میں قدرے سکون ہوا تو میں نے کہا کہ رشیدہ! تم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں اور میں نے اسے جس سکون اور تحمل سے سنا اس کی زندہ شہادت تمہاری پرچ میں پیالیاں ہیں جو ابھی تک صحیح سلامت پڑی ہیں، ورنہ تم تو میرے کالج کے زمانے کے غصے سے واقف ہو۔ اب میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کیا تم بھی اسے اسی طرح سکون اور متانت سے سنو گی۔

سُن لوں گی۔ اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں نے کہا۔ شکریہ اور اب غور سے سنو۔ سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے صدرِ اول کے مسلمانوں کے جو حالات بیان کئے ہیں تمہیں ان کا علم کس طرح سے ہوا۔ اس نے کہا، کہ میں نے یہ واقعات اپنی طرف سے تو بیان نہیں کئے، طبری کی اُس تاریخ سے پڑھ کر سنائے ہیں جو سب سے پہلی اور سب سے مستند تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ طبری نے یہ تاریخ کب مدون کی تھی۔ یہ مدون کی گئی تھی تیسری صدی ہجری کے اخیر میں۔ طبری نے ۳۱۰ھ میں وفات پائی تھی اور یہ کسی سابقہ تحریری ریکارڈ پر مبنی نہیں۔ اس کا انداز یہ ہے کہ میں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا اور اس نے فلاں سے۔ اس طرح سے یہ تاریخ مرتب ہوئی اور اس میں تین سو سال پہلے کے واقعات اس تفصیل کے ساتھ درج کر دیئے گئے کہ مثلاً جو گفتگو عین میدانِ جنگ میں دو سپاہیوں کے درمیان اُس وقت ہوئی جب ایک کا خنجر دوسرے کے سینے میں پیوست تھا اور وہ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے تھے تو اسے بھی لفظ بلفظ یوں لکھ دیا گیا جیسے امام طبری (REFREE) کی حیثیت سے ان دونوں کے درمیان کھڑے سب کچھ سُن رہے تھے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اور معیاروں کو چھوڑو، خالص فنِ تاریخ کے معیار کی رُو سے اس طرح مرتب شدہ تاریخ کسی صورت میں بھی قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے؟ تم تو ہسٹری کی سٹوڈنٹ ہو اور اب ماشاء اللہ اس پر اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی (THESIS) لکھ رہی ہو، کیا تحقیقاتی نقطۂ نگاہ سے اس قسم کی تاریخ کو کچھ بھی وقعت دی جا سکتی ہے؟ مجھے کم از کم تم سے اس کی توقع نہ تھی کہ تم اس قسم کی تاریخ میں مندرج واقعات کو "ٹھوس حقائق"

کہہ کر خود تسلیم کر لوگی اور دوسروں کے سامنے پیش کرو گی۔ تمہارے جیسی ذہین لڑکی کو اس قسم کا مقلد تو نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ جو کچھ لوگ کہتے ہیں اُسے آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لو۔

رحیلہ کرسی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور عجیب حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بالکل ساکت و صامت تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا کہ اگر یہ تاریخ قابلِ اعتماد نہیں تو پھر اُس عہد کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہم کہاں جائیں؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور تاریخی ماخذ بھی ہے۔

میں نے کہا کہ جہاں تک صدرِ اول کے مسلمانوں یعنی رسول اللہ اور آپؐ کے اصحابؓ کا تعلق ہے ایک اور تاریخ بھی ہے۔ وہ تاریخ ان حضرات کی ہمعصر (CONTEMPORARY) ہے۔ یعنی وہ خود ان ہی کے زمانے میں ان کے سامنے محفوظ کی گئی اور اس میں آج تک ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ اس نے میری طرف انتہائی حیرت سے دیکھا اور طنز آمیز انداز سے کہنے لگی کہ وہ کون سی تاریخ ہے جو آج تک مؤرخین اور محققین کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی اور اس کا نسخہ صرف تمہیں کو مل سکا؟

میں نے کہا کہ وہ نسخہ نہ تو (DEAD SEA SCROLLS) کی طرح کہیں غاروں میں مدفون تھا، جو مؤرخوں کو نہ مل سکا، اور نہ ہی روحانیت کے مدعیوں کے سینوں میں مستور جس تک محققین کی رسائی نہ ہو سکی۔ وہ تو چودہ سو سال سے ہر مسلمان کے گھر میں موجود تھا اور خود تمہارے گھر میں بھی موجود ہے۔

میرے گھر میں؟ اس نے انتہائی تعجب سے پوچھا — ہاں تمہارے گھر میں بھی — میں نے کہا۔ وہ دیکھو سامنے شیلف میں سب سے اونچے مقام پر کیا رکھا ہے؟

وہ تو قرآن شریف ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ وہ کوئی تاریخ کی کتاب تو نہیں ہے بے شک، وہ ان معنوں میں تاریخ کی کتاب نہیں جن معنوں میں تم کسی کتاب کو تاریخ کی کتاب کہتی ہو۔ میں نے کہا۔ لیکن وہ "اُم التاریخ" ہے۔ یعنی اس میں تاریخ کے جانچنے اور پرکھنے کے اصول دیئے گئے ہیں، جن سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ تاریخ میں صدرِ اول کے مسلمانوں کے متعلق جو واقعات مذکور ہیں، ان میں کون سے سچے ہیں اور کونسے وضعی افسانے۔ اگر تم ان اصولوں کو سامنے رکھ کر طبری کا مطالعہ کرتی تو نہ اس کشمکش میں گرفتار ہوتی جس نے تمہارے دل و دماغ کو طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا ہے اور نہ ہی اسلام سے برگشتہ ہوتی۔

وہ ان باتوں کو ایسے سن رہی تھی جیسے وہ اس کے سامنے پہلی بار آئی ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ اصول کیا ہیں۔ میں نے کہا کہ نہایت مختصر لیکن بڑے جامع۔ انہیں غور سے سنو۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ رفقائے رسول اللہ یعنی مہاجرین و انصار سب مومن حقہ تھے اور مومنین کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں۔ اس میں ان خصوصیات کو اس قدر تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ ان سے ایک مومن کی ساری زندگی آئینے کی طرح سامنے آجاتی ہے۔

صدرِ اول کے مسلمانوں کے متعلق قرآن کی اس شہادت اور وضاحت کے بعد تم طبری یا اُس دور کی کسی اور تاریخ کو اٹھا کر دیکھو۔ اس میں محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے متعلق جو واقعات ایسے ہوں جو ایک مومن کی زندگی کے معیار پر پورے اُتریں، انہیں صحیح تسلیم کر لو، جو اس کے خلاف ہوں انہیں وضعی اصلنے قرار دو۔ بات صاف ہو جائے گی۔

اس نے کہا تو کیا یہ تمام واقعات جن کا میں نے ذکر کیا ہے، جھوٹے ہیں۔ میں نے کہا کہ جھوٹے اور بالکل جھوٹے۔ اس لئے کہ انہیں سچا ماننے سے خدا کی اس شہادت کی تکذیب ہوتی ہے کہ وہ حضرات مومنین حقہ تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک خدا کی ایک شہادت کے مقابلے میں انسانوں کی ہزار تصانیف بھی پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اس نے کہا کہ پھر تو مجھے اپنے مقالہ کا موضوع بدلنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ نہیں اپنے مقالہ کا موضوع بدلنا پڑے گا اور مسلمانوں کو اپنے صدرِ اول کی تاریخ از سرِ نو لکھنی ہوگی۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ہماری نئی نسل کا ہر سمجھدار نوجوان مروجہ تاریخ کے مطالعہ کے بعد پہلے یہ پوچھیگا کہ ـــــ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

اور جب اسے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ملے گا جو ہماری تاریخ کی ان کتابوں کی موجودگی میں، جس پر بدقسمتی سے تقدس کے غلاف چڑھا دیئے گئے ہیں، کبھی نہیں مل سکتا ـــ تو وہ تمہاری طرح اسلام سے برگشتہ ہو کر دہریت کی گود میں چلا جائے گا اور پھر ہمارا مقدسین کا طائفہ یہ کہہ کر خوش ہو جائے گا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ پوچھ کر ہمیں تنگ کرنے والا کوئی نہیں رہا کہ

"اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

گورکنوں کو قبرستان میں کتنا سکون ملتا ہے! ۰ والسلام!

ـــــــ (۶۶) ـــــــ

محمد منظور پرویز
بی۔ اے

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

صدرِ محترم۔ میری عزیز بہنو اور بھائیو!

مجھے اس راہ رو سے پوری پوری ہمدردی ہے جس کی حالت یہ ہے کہ ؎

حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی روئیے	جو تھک گیا ہو سامنے منزل کے بیٹھ کر

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے اسے اِس مقام تک پہنچا دیا۔ ان اسباب کا سِرا ہمیں بہت پیچھے جا کر ملیگا۔ سچ پوچھئے تو اِس بیچارے کو پہلے دن ہی سے غلط راستے پر ڈال دیا گیا تھا۔

مشہور ماہر نفسیات' ایڈلر' اپنے عمر بھر کے تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بچے نے اپنی سیرت و کردار کی رُو سے آگے چل کر جو کچھ بننا ہو، اس کی بنیادیں اُس وقت تک مکمل ہو جاتی ہیں جب وہ ہنوز چار برس کی عمر کا ہوتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ ہمارے ہاں بچے کی چار برس کی عمر تک کس قسم کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں — وہ ذرا رویا تو بلی کے کڑکے جیسی آواز کے ساتھ کہا گیا کہ وہ بھالو آیا — وہ بھاگ آیا — وہ نیکی آئی — اس معصوم کے ننھے سے دل پر بھالو، بھاگ اور نیکی کے وحشتناک، ڈراونے، بھوت اس طرح مسلط ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کی گرفت سے عمر بھر نکلنے نہیں پاتا۔ دن کو اماں یوں ڈراتی رہیں اور رات کو دادی اماں نے سبز پری اور سفید جن، سلیمانی ٹوپی اور خضری سُرمے کے افیونی افسانے سنا سنا کر اُس کے دماغ کو توہم پرستیوں کا ویرانہ بنا دیا۔

بچہ پانچ برس کا ہوا تو ابا جی اُسے اسکول داخل کرانے کے لئے لے گئے۔ وہ گھر سے خوشی خوشی چلا لیکن ابھی مدرسے کے صحن ہی میں پہنچا تھا کہ دور سے ساڑ ساڑ کی کپکپا دینے والی آوازوں کے ساتھ' نہیں ماسٹر جی، مر گیا ماسٹر جی' کی چیخ و پکار نے اُس کا کلی کا سا دل مرجھا کر رکھ دیا۔ باپ اسے مدرسے یوں چھوڑ آیا جیسے چرواہا بکری کو قصاب کے ہاتھ بیچ آیا ہو۔ اور یہ حادثہ کوئی ایک آدھ دن کا نہیں، یہ اب اُس کا عمر بھر کا رونا ہے۔ ماسٹر جی کے بید کی شکایت گھر میں کی تو ابا نے طمانچہ مار کر اس کا ازالہ کیا۔ اس اذیت سے بچنے کے لئے اُس نے بہانہ سازیاں شروع کر دیں۔ آج مدرسے میں بیمار ہو گئے۔ کل گھر والوں کو فریب دے دیا۔ آگے بڑھا تو اسلامیات کا مضمون نصاب میں داخل ہو گیا۔ یہ مضمون لازمی تھا اس لئے اسے چھوڑا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس میں پہلے ہی دن شریعت حقہ کا یہ فیصلہ سامنے آیا کہ سچ بولنا بے شک بڑی اچھی بات ہے لیکن زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف شرعاً اجازت ہوتی ہے بلکہ اُس وقت جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور آپ حضرات کو اس کا تو علم ہی ہوگا کہ شریعت کی رُو سے واجب کا ترک کر دینے والا سخت گنہگار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ جھوٹ بولتا تھا تو اس کے سینے میں کوئی غیر محسوس سی آواز اسے ملامت کرتی تھی۔ اب نہ صرف یہ کہ اُس آواز نے اِس سے قطع کلام کر لیا بلکہ جھوٹ بول کر یہ اپنے آپ کو مقدس شمار کرنے لگ گیا۔ لیکن آپ اپنے شعور کو فریب دے سکتے ہیں لاشعور کو نہیں۔ وہاں اس قسم کے تضادات کی گرہیں بندھی رہتی ہیں۔

اس کے بعد کالج میں پہنچے تو ایک پیریڈ میں آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت اور جیمز جین کی فلکیات کی تحقیقات سامنے آئیں اور دوسرے ہی پیریڈ میں مولانا صاحب نے فرمایا کہ مدینہ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کا ابھی ابھی یہ فتوٰے موصول ہوا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ زمین گول ہے اور گردش کرتی ہے' اسے مرتد قرار دے کر صلیب پر

چڑھا دینا چاہیئے۔ شام کو کالج سے باہر نکلے تو "زندہ باد" "مردہ باد" کے فلک بوس نعرے لگاتا ہوا ایک عظیم الشان جلوس سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نوجوان نے بھی "یا علی مدد" کہہ کر جلوس کے متلاطم تیز سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ پارٹی کے فروغ کی خاطر جھوٹ بولا۔ دوسروں کو فریب دیا۔ مخالفین پر کیچڑ اچھالا۔ دھواں دھار تقریروں میں سرد کو گالیاں دیں۔ عوام کو قانون شکنی پر ابھارا۔ چھ مہینے کے لئے جیل جا پہنچے۔ اتفاق سے جس جیل میں یہ نوجوان گیا وہیں پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر بھی نظر بند تھے۔ اس طرح ان کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تو اُن کی نقاب کے پیچھے چھپی ہوئی زندگی اپنے اصلی روپ میں سامنے آئی۔ اس سے اُس کی روح نے بغاوت کی۔ باہر آیا تو پالیٹکس کو تیاگ کر ملازمت کی تلاش میں نکلا۔ جس دفتر میں پہنچا، دروازے پر (NO VACANCY) کا بورڈ آویزاں دیکھا۔ لیکن چپراسی نے کان میں کہا کہ دو سو روپے صاحب کو دے دو تو آج ہی کام بن جائے گا۔ کچھ دنوں تک اس خیال سے سرکشی برتی۔ ویسے بھی پیسہ پاس نہیں تھا، دو سو روپیہ کہاں سے آتا۔ ماں باپ سے مدت سے قطع تعلق تھا۔ بار تھک کر ایک دن کسی کے ہاں چوری کی اور تین سو روپیہ جیب میں لیکر دفتر کی طرف چلا۔ بس میں بھیڑ تھی۔ باہر پائیدان کے ساتھ لٹک گیا۔ بس کو دھچکا لگا تو نیچے گر گیا اور سر پر چوٹ کھانے سے بیہوش ہو گیا۔ دو چار راہ روؤں نے ترس کھایا تو اُسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر نے نہایت میکانکی انداز میں کہہ دیا کہ کوئی بیڈ خالی نہیں۔ وہ اسے ہسپتال کے برآمدے میں لٹا کر چلے آئے۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ جیب کٹ چکی تھی، روپیہ غائب تھا۔ اس حالت میں نہ معلوم کب کا سُنا ہوا اقبال کا یہ مصرع بے ساختہ اُس کی زبان پر آ گیا کہ — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے! — اس کے اردگرد سے تو اس کے اس سوال کا جواب کسی نے نہ دیا۔ البتہ دور سے ریڈیو کی آواز اُس کے کان میں آئی جس میں کوئی قوال گا رہا تھا کہ —

اے مسلماں پوچھ اپنے دل سے مُلّا سے نہ پوچھ

اور جب اُس نے اپنے دل سے پوچھا تو ماں کا ہاؤ اور بھاگ، دادی اماں کا سفید جن اور سبز پریاں، ماسٹر جی کا ڈنڈا، ابا کا طمانچہ، جھوٹ کے واجب ہونے کا فتویٰ، مدینہ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کا مضحکہ انگیز فیصلہ، لیڈروں کی پس پردہ زندگی، دفتروں کی رشوتیں، بس کے مسافروں کی بے بسی، ہمدردوں کی جیب تراشیاں، مشفق اور غمگسار ڈاکٹروں کا حسنِ سلوک — ایک ایک کر کے اُس کے ذہن کے پردہ سیمیں پر سینما کے فلم کی طرح سین پر سین پیش کئے چلے جا رہے تھے کہ اتنے میں اُس نے سنا کہ اندر کمرے میں ڈاکٹر صاحب کسی چیچک کے مریض سے کہہ رہے تھے کہ — بھائی! چیچک کا علاج ایک ایک چھالے پر مرہم لگانے سے نہیں ہوا کرتا۔ یہ خون کی خرابی ہوتی ہے، اور اس کا علاج خون سے ان جراثیم کا صاف کرنا ہوتا ہے۔ یہ سنکر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کی سوچ سچی تھی۔ اس کے سوال کا جواب کسی ایک گوشے سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے لئے پورے کے پورے معاشرہ کے نظام کو

بدلنے کی ضرورت تھی۔ اس کا جھولا جھلانے والے ہاتھ سے لیکر ایوانِ حکومت کے قلمدان تک ہر شے کے بدلنے کی ضرورت۔ یا یوں سمجھئے کہ یہ راستہ پوچھنے والا مسافر کسی شہر کی گلی محلوں میں نہیں کھو گیا تھا کہ اسے سڑک کا نام بتا دیا جاتے۔ تو وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے۔ وہ تو ایک ریگستان کے ویرانے میں کھڑا تھا جہاں کسی سڑک کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس سے یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ دور سے گزرنے والے قافلہ کی گھنٹیوں کی آواز کا پیچھا کر کے شریکِ کارواں ہو جاتے۔ وہ اسے منزل تک پہنچا دے گا۔

اور ظاہر ہے کہ آج اس لق و دق صحرا میں طلوعِ اسلام کے سوا اور کونسا قافلہ ہے جس کی آوازِ رحیل بھولے بھٹکے مسافروں کے لئے دلیلِ راہ بن سکے۔ والسلام!

سلمیٰ پرویز
(ایم۔اے۔ فاضل)

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

میرے واجب الاحترام بزرگو - اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو!

میں آپ کے سامنے حاضر ہوتی ہوں تو دیکھ رہی ہوں کہ آپ میں سے اکثر بزرگوں کے چہروں پر عجیب تبسم کی معنی خیز ہنسی پھر گئی ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہے ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہیں کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

لیکن آپ مطمئن رہیں حسن نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اب اپنا قصہ نہیں چھیڑے گا۔ آپ اطمینان سے سو جیئے۔ سالِ گزشتہ جب میں نے غالباً آٹھویں بار کالج کی تعمیر کے متعلق آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلایا تو میں نے محسوس کیا کہ بات اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ

ان کی مژگاں پر ستارے، اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے

تو میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب آپ کو اس کی یاد کبھی نہیں دلاؤں گی مجھے اتنا گلہ ضرور تھا۔ کہ ؎

جن اسیروں کے مقدر میں نہ تھی سیرِ چمن
ان کو آخر کیوں بہاروں کے پیام آتے رہے؟

مجھے یقین ہے کہ کالج بنے گا اور ضرور بنے گا۔ میرے باباجی کا کوئی خواب آج تک بغیر تعبیر کے نہیں رہا۔ لیکن میں تو پکارتے پکارتے اپنی تعلیم کے آخری سال میں آ پہنچی ہوں۔ اس لئے ؎

یوں تو فصلِ گل بھی آئے گی مگر
جو کلی مرجھا گئی، مرجھا گئی

میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! علامہ اقبالؒ کا جو مصرعہ ہمارے آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے یعنی ـــــ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے! ـــــ اس میں 'اب' کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ اس میں سوال کرنے والے کی زندگی کے ماضی کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں ـــــ اس کے ناکام تجربات کی تلخیاں ـــــ اس کی خون گشتہ آرزوؤں کی زہر آلود یادیں، اس کی ان معصوم توقعات کی شکست کی پُرسوز صدائیں جو اس نے بڑی بڑی بام ہائے بلند سے باندھیں لیکن جو بُری طرح سے ٹوٹیں ـــــ اس کی اُن دلکش امیدوں کی صدائے بازگشت، جو اسے بڑے بڑے مقدس آستانوں کی طرف کشاں کشاں لے گئی، لیکن جہاں سے وہ باصد حسرت و یاس کفِ افسوس ملتا ہوا واپس آیا۔ سوچئے کہ جو حرماں نصیب اس قدر ناکامیوں کی تلخ یادیں اپنے دل میں لئے زندگی کے دوراہے پر اس طرح پکار رہا ہو ـــــ اور پکارنے والا بھی ہو اقبال جیسا دیدہ ور ـــــ تو اس کا سوال کس قدر گہری سوچ کا محتاج اور اُس کا جواب کس قدر حتمی و یقین کا متقاضی ہوگا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس کے جواب تک پہنچیں، آیئے ... دیکھیں کہ وہ کون کون سی خار دار وادیاں تھیں جن سے گزرنے کے بعد یہ رہ نورد زندگی کے اس دوراہے پر پہنچکر یوں ہمہ تن استفسار بن رہا ہے۔

جب اقبال کے شعور نے آنکھ کھولی تو ساری دنیا میں تہذیبِ مغرب کا غلغلہ بلند تھا۔ ہر طرف اس کے چرچے ہو رہے تھے۔ ہر جگہ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ یہاں کے دانشوروں نے اس نوجوان سے کہا کہ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اگر یہ دیکھنا چاہو کہ انسان نے کس قدر ترقی کی ہے تو یورپ جاؤ ـــــ چنانچہ اقبال کشاں کشاں یورپ چلا گیا۔ اس نے وہاں کی ہر شے کو نہایت غائر نظروں سے دیکھا ـــــ ہر چیز کا گہرا مطالعہ کیا۔ واپسی پر جب اُس سے پوچھا گیا کہ تہذیبِ مغرب کے متعلق کیا خیال ہے؟ تو اس نے نہایت مایوسانہ انداز سے کہا ؎

کہ نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ مغرب کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

قدامت پرست طبقہ نے اس سے کہا کہ تم نے ولایت جا کر دیکھ لیا۔ اب آؤ اپنے گھر کی طرف جس چیز کی تمہیں تلاش ہے، وہ اربابِ شریعت کے ہاں ملے گی۔ تم ان بارگاہوں میں جاؤ اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرو۔ اس پر اقبال مکتبوں، دارالعلوموں، مسجدوں، وعظ خانوں میں پہنچا اور اربابِ شریعت کی فکری صلاحیتوں اور سیرت و کردار کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ واپسی پر ناصحینِ مشفق نے پوچھا کہ کہو! تم نے اربابِ شریعت کو کیسا پایا۔ اُس نے ایک آہِ سرد کھینچی اور کہا کہ اس باب میں میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہراؓ

ایک طرف سے کسی نے اس کے کان میں کہا کہ یہ اہلِ شریعت تو ظواہر پرست ہیں۔ زندگی کا سراغ تمہیں اہلِ طریقت کے ہاں ملے گا۔ ان کے ہاں جاؤ۔ چنانچہ اب اقبالؒ ان مدعیانِ روحانیت کی خانقاہوں میں پہنچا اور ان کے سینوں میں بڑی گہری نظروں سے جھانکا اور بصد حسرت و یاس یہ کہہ کر واپس آگیا ؎

کہ اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

پھر اس کی نظریں اربابِ حکومت کی طرف اٹھیں تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ؎

کہ فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

پھر اس نے قوم کے لیڈروں کی طرف دیکھا تو بیچاری قوم کی محرومی اور بیکسی پر یہ کہہ کر خون کے آنسو بہائے ؎

کہ نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

اور جب پوری ملتِ اسلامیہ کی حالت پر غور کیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یہ تھا وہ مقام جہاں پہنچ کر اس نے کہا تھا کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

لیکن یہ آواز کسی مایوس کی آہِ سرد نہیں تھی ـــ مایوس تو تھک کر پاشکستہ بیٹھ جاتا ہے۔ وہ راستوں کا پتہ نشان نہیں پوچھا کرتا۔ مایوس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی ؟
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

یہ آواز تھی ایک ایسے مسافر کی جس کے دل میں منزل کی تڑپ موجود تھی۔ اسی لئے اقبالؒ نے اس قسم کے نوجوانوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی !

اس لئے اس نے اس ہمدرد سوال راہی سے کہا کہ تجھے منزل کی تلاش ہے تو اس کا پتہ نشان ان سے مت پوچھ جو خود راہ گم کردہ ہیں۔ اس کے لئے ؎

تراشی از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

زندگی کی سنگلاخ زمینوں میں اُن نشانات کے ساتھ ساتھ چل کر جو خالقِ کائنات نے بذریعہ وحی لگائے ہیں اپنا راستہ آپ تراشو، منزلِ مسکراتی ہوئی سامنے آجائے گی۔ ورنہ یاد رکھو۔

سکندری ہو، قلندری ہو، یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

والسلام:

سید حسن عباس رضوی

ارشاداتِ صدرِ مجلسِ مذاکرہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ نظر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بےباک مرا

بستانِ قرآنی کے نو دمیدہ غنچو! اس میں تمہارے اضطراب کی، تمہاری پاکیزہ تمناؤں اور حسین آرزوؤں نے نبضِ کائنات میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ تمہارے تنفسِ حیات کی شعلہ سامانیوں سے پژمردگی کے یخ بستہ تودے پگھل گئے ہیں اور قلزمِ حیات کے طوفان اتھاہ گہرائیوں سے ابھر کر موجوں میں کروٹیں لینے لگے ہیں۔ دل کا یہ حال ہے کہ ایک بار پھر وہی دیرینہ آرزو مچلنے لگی ہے کہ

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

یہ آرزوئیں، یہ تمنائیں، یہ آہیں، صرف مجھے اور آپ کو ہی نہیں، ہر شخص کو وقفِ اضطراب کئے ہوتے ہیں جو قلبِ سلیم رکھتا ہے۔ مگر آپ میں سے بعض نوجوانوں کے طرزِ خطاب سے قدرے مایوسی جھلکتی ہے۔ شاید اس لئے کہ گرد و پیش کی ہنگامہ آرائیوں اور ہجومِ مخالفت سے آپ گھبرا گئے ہیں۔ نہیں!

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ رہروانِ راہِ عشق کے لئے ایسے مواقع پیدا کرتا رہتا ہے جس سے ان کے پوشیدہ جوہر کی نمود ہو سکے۔

اے رہروانِ جادۂ قرآنی! جن پُرخطر راستوں، خاردار وادیوں، اور تنگ و تاریک گھاٹیوں سے آپ گزر رہے ہیں ——

گزرا تھا کبھی میں بھی اسی راہ گزر سے

اور میرے دل نے بھی کبھی خالقِ کائنات سے یہی سوال کیا تھا کہ

"اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

بایں ہمہ

رواں دواں ہی رہا کاروانِ صدق و وفا
اگرچہ راہ میں سنگِ گراں بھی آتے ہیں

اور آخرکار میرے سوال کا جواب مِل گیا کہ "جس ہدایت کی آرزو کر رہے ہو وہ اس ضابطۂ قوانین یعنی "قرآن" کے اندر محفوظ ہے جس میں نہ کوئی بے یقینی نہ تذبذب۔ اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن نہ ذہنی کشمکش۔ سفرِ زندگی میں اس سے بڑھ کر اور کیا زادِ راہ ہو سکتا ہے؟

بہت سنا کئے کہ کوئی مہدی، کوئی امام، کوئی مسیح موعود، کوئی مزاج شناسِ رسولؐ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا موجب ہوگا۔ سنا ہی نہیں بلکہ ان میں سے بعض کو دیکھا بھی۔ مہدویت و مسیحیت کے کئی داعیوں نے بلند بانگ دعوے کئے لیکن ان کی اپنی خودی بیدار نہ تھی وہ قوم کی نشاۃِ ثانیہ کی طرف کیا راہ نمائی کرتے۔ آخر عقدہ کھلا کہ جب تک ہم نہ بدلیں گے، یہ جہاں نہیں بدلے گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب آدم حکمِ خداوندی سے اعراض برتنے پر جنت جیسے مقامِ بلند سے گر گیا اور اس کے دِل میں اپنے ہبوط اور انحطاط کا احساس جاگا تو وہ خالقِ حقیقی کے حضور جھک گیا اور التجا کی "بارالہا! کیا بازآفرینی کی کوئی صورت ہے؟" جواب ملا "کیوں نہیں! لیکن تم اقرار تو کرو کہ یہ سب کچھ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تمہاری قسمت میں ایسا نہیں لکھا تھا۔ تمثیلِ آدم کے ہیرو کو بھی قلبِ سلیم بخشا گیا تھا۔ اُس کے اندر بھی بازآفرینی کی آرزو موجود تھی۔ اس نے کہا "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۔ ⁷⁄₂₃" اپنے آپ پر یہ ظلم ہم نے خود ہی کیا ہے۔ ورنہ "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" تیری طرف سے تو خیر ہی خیر ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

(تو پھر اب ایسا ہوگا) کہ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے، تو جو کوئی اس ہدایت

کا اتباع کرے گا وہ ہر قسم کے خوف و خطرات سے محفوظ اور بے حزن و ملال منزلِ مقصود تک

جا پہنچے گا۔"

ہدایت آ گئی۔ اس ہدایت کے اتباع کی بدولت اور جہدِ مسلسل کے باعث اس پر بازآفرینی کی راہیں کھل گئیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اتباعِ ہدایت سے کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لئے بھی ایک عرصۂ دراز درکار ہوتا ہے۔ کئی تدریجی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک جست میں نہیں ہو جاتا۔

میرے ہمسفرو! تاریخ کی ورق گردانی کے بعد جب ہم اپنی کیفیت کا جائزہ لیتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں جبکہ ہمارے گرد و پیش مایوسیوں کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ کیا اسلام کی بازآفرینی کی کوئی صورت بن سکتی ہے اور یقیناً ہے ۔۔۔ نہ مرض نیا ہے نہ ہی علاج نیا۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

یعنی تمسک بالقرآن ۔۔۔ قرآنِ حکیم اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ آج بھی ہمارے یہاں موجود ہے۔ آج بھی قوانینِ خداوندی کے اتباع سے وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جسے ماضی کی آنکھ نے دیکھا ہے اور حال دیدہ براہ ہے لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا حصہ صرف اتنا ہی رہ گیا ہے کہ "از یٰسینِ او آساں بمیری"۔ ہم اس کی حکمت سے زندگی کے طلبگار ہی نہیں ہوتے ورنہ وہ تو ایسا سرچشمۂ حیات ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ اور اپنا اتباع کرنے والوں کو حیاتِ ابدی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

میرے ہمنواؤ ۔۔۔! داستانِ بنی اسرائیل شاہد ہے کہ جس قوم کے حوصلے پست، افکار پریشان، اعمال کاسد، نگاہیں بے نور اور قلب بے حضور ہو جائیں اُس قوم کی نشاۃ ثانیہ کی امید کا رشتہ صرف نئی ابھرنے والی نسلوں سے وابستہ رہ جاتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اُن کے قلب و دماغ کی محفوظ صلاحیتوں، جرأتِ کردار، ندرتِ فکر، حرارتِ خون اور ہر رکاوٹ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے کی ہمت کو تعمیری جذبہ سے آشنا کیا جائے۔ نیا دور ایسے ہی نوجوانوں کے خارہ شگاف ارادوں کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اور اگر نئی پود کی بے باکیوں کو بے مہار چھوڑ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ طوفان جس طرف جائے گا، تباہی و بربادی کا پیغام لے کر جائے گا۔ صلاحیتوں کو حدود آشنا رکھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت سامانیاں، حضرت موسیٰؑ کی صحرا نوردیاں اور اسوۂ محمدیؐ کی استقامت پذیریاں شاہد ہیں کہ "یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" کے بغیر قوم کی تعمیر ممکن نہیں۔ پاکستان کے معمارِ اوّل سرسید علیہ الرحمۃ نے اسی سنتِ انبیاء پر عمل کیا اور علیگڑھ میں ایک تعلیمی درسگاہ کی بنیاد رکھی جس کا نتیجہ مملکتِ پاکستان کی شکل میں برآمد ہوا۔ پاکستان تو حاصل ہو گیا لیکن

جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ مقصد ابھی باقی ہے۔ وہ مقصد تھا "نظامِ ربوبیت" کا قیام جس کا تجربہ حضرت یوسفؑ نے مصر میں کیا اور جس کے مکمل خدوخال سے حضور ختمی المرتبت صلے اللہ علیہ وسلم نے روشناس کرایا۔

نقیبانِ قافلۂ قرآنی! بابا جی بھی ہمیں اسی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ایک ایسی درسگاہ جو اس جماعت کو تیار کرے جس کے ہاتھوں سرزمینِ پاکستان میں وہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے جو امنِ عامہ کا ذمہ دار ہو اور جس کے قیام سے مایوسیوں کی گھٹائیں بارانِ رحمت میں بدل جائیں اور یہ سوال ہی پیدا نہ ہو کہ "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔"

قوم کے نونہالو! دیکھنا آپ سے کوئی "السابقون الاولون" کا شرف چھین کر نہ لے جائے۔ بابا جی کی انتھک تگ و تاز، کاوشِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا حاصل یہ گلستان ہے جس کے آپ بھی ننھے ننھے پودے ہیں۔ وہ پودے جنہیں بابا جی نے جگر کا خون دے کر پالا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ دیئے سے دیا جلتا چلا جائے اور کہانی وہیں سے آگے چلے جہاں آپ کہتے کہتے رک جائیں۔ آپ دنیا کی قید سے بے نیاز ہو کر یقینِ محکم کے ساتھ شمعِ قرآنی کی روشنی میں آگے بڑھتے چلیں۔ نتائج آپ کی زندگی میں مرتب ہوں یا آپ کے بعد، اس کا حساب کے ذمے ہے۔ "زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد ماند" ۔ "كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" ۔ تم ہی وہ بہترین امت ہو جو تمام نوعِ انسانی کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہو تمہارا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ قوانینِ الٰہیہ کا حکم عام کرو اور لوگوں کو اس کی خلاف ورزی سے روکو۔ آپ کا سر اس فخر سے اونچا ہونا چاہیئے کہ آپ اس دور میں پیدا ہوئے جس دور نے پرویز جیسے مفکر کو جنم دیا، اور آپ کو اپنے اصلی مقام سے روشناس کرایا۔ آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم اس مردِ قلندر کو مایوس نہیں کریں گے جس نے ہماری کشتِ امید کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے اور جو انتہائی جذب و کیف اور والہانہ بے تابی سے اقبال کے الفاظ میں خدا کے حضور ہمیشہ التجا کیا کرتے ہیں۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ؕ

ڈکٹنٹ

پروفیسر رفیع اللہ

اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید اور عربی زبان

ہمارے صاحبِ فکر اہلِ علم نے قیامِ پاکستان سے بھی بہت پہلے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والا شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جسے اس بارے میں مفکرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی کوششوں کا علم نہ ہو۔ علامہ صاحب کی دلچسپی کا تو یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک خاکہ تک مرتب کر دیا تھا۔ لیکن اسے امتِ مسلمہ کی بدقسمتی سمجھئے کہ زندگی نے انہیں اس میں رنگ بھرنے کی مہلت نہ دی ورنہ وہ بڑی معیاری چیز ہوتی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ خاکہ بہت ہی ناقص شکل میں دستیاب ہوا جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کن خطوط پر یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ اس خاکے سے اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کے بارے میں کوئی رہنمائی حاصل ہو یا نہ ہو یہ حقیقت تو سامنے آ جاتی ہے کہ علامہ صاحب اس کام کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید نے اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مملکت کے قیام کا مقصد ہی ملک میں اسلامی نظامِ حیات قائم کرنا تھا اور پھر خوش قسمتی سے یہ مسئلہ ان مسائل میں سے تھا جن کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔ اگرچہ اس کی تفصیلات میں گوناگوں اختلافات ضرور ہیں لیکن نفسِ مسئلہ سے کسی کو بھی اختلاف نہیں رہا۔ اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے لوگوں کی نظریں عام طور پر ان لوگوں کی طرف اٹھتی رہی ہیں جو اس منصوبہ کی اہمیت کا اعلان ان الفاظ میں فرماتے رہے تھے۔

"موجودہ دور میں اسلامی ریاست کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اسلامی قانون کی تدوینِ جدید ہے۔ جس کے بغیر اول تو یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور ہو بھی جائے تو وقت کے اہم مسائل سے ٹکرا کر خوابِ پریشاں ہو جائے گا۔ آج اسلامی نظام کے حامیوں کے لئے زمانہ پھر ویسا ہی چیلنج سامنے لے آیا ہے جیسا پہلی اور دوسری صدی ہجری میں دنیا کے بہت سے متمدن ممالک پر اسلام کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد وہ لیکر آیا تھا۔

(ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی۔ اسلامی قانون نمبر جلد دوم بطفیل اول)

لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس منصوبے کی اس اہمیت کے باوجود اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہو سکا۔ ہمارے علمائے کرام میں زیادہ سے زیادہ جو حرکت ہوئی وہ اتنی ہی تھی کہ وقتاً فوقتاً حکومت سے اسلامی قانون کے نفاذ اور تدوین کا مطالبہ کر دیا جائے اور بس۔ مختلف اوقات میں برسرِ اقتدار آنے والی حکومتیں اس بارے میں کسی قدر دلچسپی لیتی رہیں لیکن چونکہ یہ منصوبہ کبھی بھی مضبوط بنیادوں پر نہ اٹھایا گیا اس لئے ان حکومتوں کے خاتمے پر یہ معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ جاتا۔ آج ہم اس منصوبہ کے لئے ایک ایسی ہی بنیاد کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ اگر ایک دفعہ اسے مضبوطی سے قائم کر دیا گیا تو ہر قسم کے سیاسی نشیب و فراز میں اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید کا کام جاری رہیگا۔

تشکیلِ جدید کون کریگا

اس بنیاد کو سامنے لانے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کون کریگا؟ یہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوال کے طے نہ ہونے کی وجہ سے تدوینِ جدید کا کام منظم طریقے سے جاری نہیں ہو سکا۔

اس وقت تک جو صورتِ حالات ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے لوگ عام طور پر علمائے کرام کی طرف دیکھتے رہے ہیں اور علماء اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت سے مطالبہ پر اکتفا کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اب تک کے طرزِ عمل سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ کام حکومت ہی سرانجام دے گی۔ حکومت اس فریضہ کو جس طرح سرانجام دے سکتی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ دو یوں کہ موجودہ دور کے جمہوری نظام میں حکومت میں قانون سازی کا آئینی طریقہ مجالسِ قانون ساز ہوتی ہے۔ یہی مجالس، ملک کے لئے مختلف قوانین بناتی ہیں اور اپنی ہیئت کے لحاظ سے عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ مجالس ہمارے علمائے دین کو بھی گوارا ہیں کیونکہ انہوں نے اسے خلافِ اسلام قرار نہیں دیا، بلکہ شاید اسے اس کے مطابق سمجھتے ہوئے ان کے لئے انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ امر واضح ہے کہ بالآخر اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کا کام یہی مجالسِ قانون ساز ہی سرانجام دیں گی۔

اس سلسلہ میں بعض گوشوں سے یہ آواز بھی بلند کی جاتی ہے کہ اس کام کے لئے علماء کا ایک بورڈ یا ادارہ بنا دیا جائے (جیسا کہ سب سے پہلی مجلسِ آئین ساز میں تجویز کیا گیا تھا) لیکن اول تو ان اداروں کی تشکیل و قیام میں جو گوناگوں مشکلات اور رکاوٹیں ہیں، سابقہ حکومتیں اس کا تجربہ کر چکی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان اداروں کے قیام کے باوجود ان کے مدوّن کردہ قوانین کو قانونی حیثیت دینے کا اصل اختیار پھر بھی مجالسِ قانون ساز ہی کو حاصل ہوگا۔

ظاہر ہے کہ ان مجالس میں قانون کی تدوینِ جدید کا کام انہی لوگوں کے سپرد کیا جائے گا جو قانون سے واقف ہوں۔

اور ہمارے ہاں قانون سے واقف وکلاء حضرات ہی ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے لاء کالجز میں جس نصاب کی تعلیم و تکمیل کے بعد طالب علم قانون کی ڈگریاں لے کر وکیل بنتے ہیں کیا اس سے یہ حضرات اس قابل ہو سکتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی تدوین جدید کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ اس مقصد کے لئے کس قسم کی صلاحیت اور استعداد درکار ہے، اور ان کی معلومات کس قدر ہونی چاہئیں یہ بحث طویل ہے لیکن اس کے لئے کم از کم اتنا تو لابد ہے کہ انہیں اسلامی قوانین کے مآخذ تک براہ راست رسائی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ماخذ عربی زبان میں ہیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ لاء کالجز کے طالب علموں کے لئے عربی زبان کا جاننا ضروری نہیں۔ اس کے نصاب میں اسلامی قانون کے متعلق انگریزی زبان میں صرف ایک کتاب ہے۔ اول تو اسلامی قانون سے واقفیت کے لئے یہ کتاب بالکل ناکافی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ طلبا اس کتاب کے مطالعہ کی بھی بہت کم زحمت گوارا کرتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ اسکے خلاصہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، اس مقصد کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ لاء کالجز کے طلبا کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان سے واقف ہوں۔ خوش قسمتی سے عربی زبان کی تعلیم کی یہ بنیادی ضرورت عوامی خزانے پر ایک پیسے کا بوجھ ڈالے بغیر بڑی آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ قانون میں داخلہ لینے والے امیدواروں کے لئے بی۔ اے میں عربی کا مضمون پڑھنا لازمی قرار دے دیا جائے۔ مختلف تعلیمی اداروں اور کالجوں میں عربی کے اساتذہ پہلے ہی سے موجود ہیں جن کے پاس طالب علموں کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے۔ لاء کالج میں داخلے کے لئے عربی جاننے کی شرط عاید ہونے کے ساتھ ہی زیادہ طالب علم یہ مضمون پڑھنے لگ جائیں گے۔ اس امر کے لئے کسی قسم کے مزید اخراجات کی تو ضرورت نہیں ہوگی اور نظام تعلیم پر اس کا اثر بڑا خوشگوار پڑے گا۔ وہ یوں کہ عربی زبان کی جماعتوں میں جہاں اس وقت طلبا کی تعداد بہت ہی کم ہے، زیادہ طالب علم آنے شروع ہو جائیں گے جس سے دوسرے مضامین کی جماعتوں میں طلبا کی تعداد نسبتاً کم ہو کر ان کے تعلیمی بوجھ کو کم کر دیگی۔

کالج کی عربی تعلیم

بی۔ اے تک عربی زبان پڑھنے سے ایک متوسط طالب علم میں اتنی قابلیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے جس کی مدد سے وہ اس زبان کی سادہ اور سہل کتابوں کا مفہوم سمجھ لے۔ اس طرح وہ قانون کے نصاب میں اسلامی فقہ (قانون) کی کسی بھی کتاب کو سبقاً سبقاً پڑھنے کے قابل ہو جائے گا۔ آجکل عرب ممالک میں اسلامی قانون (فقہ) پر بڑی عمدہ اور سہل کتابیں تیار کی جا رہی ہیں۔ مثلاً ان میں سے الفقہ علی المذاہب الاربعۃ اور موسوعۃ جمال عبدالناصر فی الفقہ الاسلامی، بڑی اچھی کتابیں ہیں جنکے سمجھنے میں ہمارے قانون کے طلبا کو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اول الذکر کتاب میں اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کے مطابق اسلامی قانون کو ترتیب دیا گیا ہے اور موخر الذکر میں موجودہ وقت کے تمام زندہ اسلامی

فقہی مذاہب (جو تعداد میں آٹھ ہیں) لیے گئے ہیں۔ قانون کے نصاب کے لئے اپنی ملکی ضروریات کے مطابق ان کتابوں سے ایک مختصر سا انتخاب تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس انتخاب کو اگر قابل اساتذہ پوری تشریحات کے ساتھ طلبار کو پڑھا دیں گے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اسلامی قانون کی دوسری کتابیں سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس قسم کی تفصیلات بعد میں طے ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے فوری ضرورت یہ ہے کہ لاء کالج میں داخلے کے خواہشمند امیدواروں کے لئے بی۔ اے تک عربی زبان کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے۔ اس شرط کے پورا ہو جانے کے بعد قانونی نصاب کی کمیٹی کے اراکین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی کونسی عربی کتاب' جدید یا قدیم داخلِ نصاب کی جائے جس سے قانون کے طلباء میں اسلامی قانون سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔ ایک دفعہ اس سادہ سی بلا خرچ تجویز پر عملدرآمد شروع ہو گیا تو ہمیں یقین ہے کہ قانون کے ہزاروں فارغ التحصیل طلباء میں سے درجنوں ایسے شائقین سامنے آ جائیں گے جو اسلامی قانون میں تخصیص حاصل کریں گے۔

عربی زبان کے مشکل ہونے کا غلط تصور

اس وقت بھی قانون کے پیشے سے تعلق رکھنے والے کئی ایسے اہلِ علم ہیں جو اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید سے حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں لیکن عربی زبان سے عدم واقفیت کی وجہ سے وہ اس بارے میں کوئی ٹھوس خدمات سرانجام نہیں دے سکتے۔ عربی زبان سے ان کے خوف اور لہٰذا غفلت کی ایک بڑی وجہ یہ غلط تصور ہے کہ یہ زبان سخت مشکل ہے۔ حالانکہ زمانہ جدید کی علمی تحقیقات کی روشنی میں اس کی تعلیم اس قدر سہل بنا دی گئی ہے کہ کوئی بھی تعلیم یافتہ فرد تھوڑی سی محنت سے چھ ماہ کے عرصے میں اسے سیکھ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اب اس قسم کے انتظامات بھی موجود ہیں کہ جو حضرات چاہیں اس زبان کو استاد کی مدد کے بغیر گھر بیٹھے بھی سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لئے قاہرہ ریڈیو کو پوسٹ بکس نمبر ۳۲۵ کے پتے پر خط لکھ کر عربی زبان سیکھنے کا ایک جدید ترین بالتصویر نصاب مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ خود ہمارے ملک میں ایسے ادارے موجود ہیں جو جدید طریقے پر عربی زبان سکھانے کی بلا معاوضہ خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ مثلاً انجمن ترقیٔ عربی اسلام آباد اور لجنۃ الارتقاء العربیہ۔ المکتبۃ العلمیہ لیک روڈ لاہور[1]

امید ہے کہ اسلامی قانون کی تدوینِ جدید سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بالخصوص اور عربی زبان سے محبت کا دعویٰ کرنے والے اہلِ علم بالعموم ہماری اس تجویز کو درخورِ اعتنا سمجھیں گے اور اس پر عملدرآمد کرانے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کریں گے۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہو گا کہ لاء کالج سے متعلق قانونی نصاب کی کمیٹی کو اس تجویز کی اہمیت کا قائل کرا دیا جائے۔ واضح رہے کہ اس طرح ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں عربی زبان کی ترویج میں جو ترقی ہو گی اس کا خوشگوار اثر صرف اسلامی قانون کی تدوینِ جدید تک ہی محدود نہیں رہیگا،

---

[1] ہمیں بذاتِ خود ان اداروں کے متعلق کوئی واقفیت نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

بلکہ یہ چیز عرب ممالک کے ساتھ ہمارے دینی، سیاسی، ثقافتی اور تجارتی روابط بڑھانے میں بڑی حد تک ممد و معاون بھی ثابت ہوگی۔

طلوعِ اسلام:

ہمارے نزدیک تو ہر مسلمان کے لئے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے لیکن اگر سرِدست اس کا انتظام نہیں ہو سکتا، تو کم از کم قانون کے طلباء کے لئے تو اسے لازمی قرار دے دیا جائے۔ مسلمان قانون دان اور عربی زبان سے ناواقف! یا للعجب۔ یہی وجہ ہے کہ مُلّا ہر وقت ان پر کاٹھی ڈالے رہتا ہے حالانکہ ان میں سے بہت کم ایسے نکلیں گے جنہیں قانون سے کچھ بھی مس ہو۔

(پ ج)

بقیہ: "مفکرِ اسلام" اور ماہرِ تعلیم

(صدا سے آگے مسلسل)

فرماتے ہیں کہ اسلامی یونیورسٹی کے طلبا کو مغربی کھیلوں کی بجائے موٹر سائیکل اور موٹر چلانا اور گھوڑے سواری وغیرہ سکھانے کا انتظام کیا جائے (ماہنامہ دعوۃ الحق۔ محولا بالا صفحہ ۹) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب نے کہیں سے غیر نصابی سرگرمیوں کی اصطلاح سن رکھی تھی۔ انہیں اس کا علم نہیں کہ جدید مغربی کھیلوں یعنی ہاکی، فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال وغیرہ کا مقصد نوجوانوں کو جسمانی طور پر آئندہ زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ یہ مقصد موٹر سائیکل یا موٹر چلانے کے سیکھنے سے کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی ایک اَن پڑھ آدمی دو چار گھنٹے کی محنت سے موٹر سائیکل چلانا سیکھ سکتا ہے۔ اسے اسلامی یونیورسٹی کے نقشے میں شامل کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ شکر ہے کہ یہ مضمون اردو اور عربی زبان میں چھپا ہے۔ اگر کہیں انگریزی زبان میں بھی شائع ہوتا تو غیر ملکی ماہرینِ تعلیم ہمارے ملک کے "ماہرِ تعلیم" کے بارے میں کیا خیال کرتے۔

(پ ج)

جہانِ نو

وہ کتابچہ جس میں طلوعِ اسلام کے شائع کردہ انقلاب آفریں لٹریچر کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک کارڈ لکھ کر

مفت طلب فرمایئے

اس قسم کا لٹریچر آپ کو اور کہیں نہیں مل سکیگا۔ (ناظم)

حقائق و عبر

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

انہیں کس جرم کی پاداش میں قتل کیا جا رہا ہے ؟

ہمارے ہاں ناکردہ گناہ، معصوم بچیوں کو معاشرہ کی کن کن ہلاکت انگیز رسوم کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے، اس کے متعلق ہم مسلسل اور پیہم لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے ایک ایسا جانگداز واقعہ آیا ہے جس سے روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اسے روزنامہ آزاد (لاہور) کی ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء میں ابراہیم جلیس صاحب نے اپنے کالم میں درج کیا ہے۔ ہم اسے جریدۂ مذکور کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔

"اخبار میں اندر کے ایک صفحہ پر ایک بہت چھوٹی سی خبر اشتہارات اور اہم خبروں کے درمیان یوں لگائی گئی ہے جیسے خبر کی اہمیت کے مدنظر نہیں بلکہ خالی جگہ پُر کرنے کے لئے لگائی گئی ہے جیسے اس خبر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس خبر کا عنوان اور متن یہ ہے۔

بارات لوٹ گئی

شیخوپورہ۔ ۱۲ جنوری۔ ایک غریب باپ اپنی بیٹی کا جہیز حسب وعدہ نہ ادا کر سکا اس لئے بارات بغیر دلہن کے لوٹ گئی۔"

غیر اہم جگہ پر لگائی ہوئی یہ خبر نہایت اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی خبر ہمارے معاشرے کا سب سے زیادہ بھیانک المیہ ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے۔

"پاکستان میں بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم انسان کون ہے ؟"

تو بلا تامل میرا جواب ہے : — "جوان بیٹی کا غریب باپ"

ہر وہ غریب باپ جو اپنی پیاری بیٹی کے لئے اپنی جان تک دے سکتا ہے لیکن اس کی شادی میں جہیز نہیں دے سکتا۔ اور جب جہیز نہیں دے سکتا تو اپنی جان دے دیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ اگر دیواروں کی زبان بھی ہوتی تو ہر ڈھلتی ہوئی رات کے سناٹے میں اس جہانِ خراب آباد کے سو میں سے پچاسی گھروں کی دیواروں سے یہ سرگوشیاں، آہیں اور کراہیں بھی سنی جا سکتی ہیں کہ

• اوخدایا ــــ کیا میری بچی گھر بیٹھے بیٹھے ہی بوڑھی ہو جائے گی۔ کیا اس کے سہرے کے پھول میری آنکھوں کے سامنے بھی کھل سکیں گے ــــ !"

• بیگم آہستہ بولو ــــ جوان لڑکی کی نیند بڑی نازک بھی ہوتی ہے۔"

• میں کیا کروں۔ مجھ سے چپ بھی تو نہیں رہا جا سکتا۔"

• میں کیا کروں ــــ ایک پیسہ بھی تو نہیں بچا کہ جہیز تو کجا صرف اس کے سہاگ کا جوڑا ہی خرید سکوں۔"

پھر ایک کرب آمیز لمبی آہ ــــ !

ایک سسکتی، جھلتی سسکی ــــ !!

پھر خاموشی۔ سناٹا۔

جوان بیٹی کی نیند واقعی بڑی نازک ہوتی ہے۔ ماں کی ایک جگر خراش سسکی اور باپ کی ایک کرب آمیز آہ سے بھی چیخ کر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور سر شرکاں سناٹے جھلملانے لگتے ہیں اور وہ سوچنے لگتی ہے۔

"یہ کرب آمیز آہ میں ہوں۔"

"یہ جگر خراش سسکی میں ہوں۔"

"میں اپنے جنم دینے والوں کے لئے ایک مجسم دکھ ہوں۔"

"میں ان کی زندگی کے پیالوں میں زہر ہلاہل ہوں۔"

اس کے بعد سورج کی پہلی کرن روشندان سے جھانک کر دیکھتی ہے کہ کسی غریب باپ کی غیرت مند بیٹی اپنے دوپٹے کے پھندے میں چھت سے لٹکی ہوئی ہے یا اپنی چارپائی پر کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند سو رہی ہے یا سمندر کی لہریں اسے بہا کر دنیا سے باہر پھینک آئی ہیں۔

پرانے عرب میں باپ اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتے تھے۔

موجودہ زمانے کے غریب باپ پرانے عرب کے جاہل باپ کی طرح ہیں جو اپنی غریب بیٹی کو زندہ لاش کی طرح رکھتے ہیں۔

دنیا کی سب سے بڑی ٹریجیڈی، سب سے بڑا حزنیہ کسی گھر آئی ہوئی بارات کا بغیر ڈولی لوٹ جانا ہے۔

یہ ٹریجیڈی، یہ حزنیہ، یہ المیہ ولیم شیکسپیئر کی ٹریجیڈیز اور راشد الخیری کے المیوں سے زیادہ کبھیا تک ہے۔ بھلا اس سے بڑی ٹریجیڈی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

میں نے بھی ایسی ہی ایک ٹریجیڈی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ پچھلے سال کراچی کے غریب متوسط انسانوں کی بستی لالوکھیت میں ایک بارات بغیر ڈولی کے لوٹ گئی تو دوسری صبح سرخ عروسی لباس میں ملبوس ایک کنواری لاش معاشرے کے سامنے ایک سوالیہ نشان کی طرح لٹک گئی۔

اس کی ماں پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گئی تھی اور باپ مادرزاد برہنہ سڑکوں پر نکل آیا اور اپنے بھیانک قہقہوں کے طمانچے دنیا والوں کے احساس کے گالوں پر تڑاتڑ مارنے لگا۔

"یارو — میرے جسم پر ایک چیتھڑا تک نہیں اور وہ دولہا میاں جہیز مانگنے آیا تھا — آہاہاہا — ہاہاہا ہی ہی..."

رات کے اندھیرے میں باپ کی آہیں ماں کی سسکیاں اور دن کے اجالے میں بیری کے جھاڑ پر پتھروں اور کنکریوں کی بوچھاڑ، پڑوسیوں کے منہ میں بھنکارتی ہوئی ناگنیں اور محلے کے چغل خور بیکاروں کے جتنے منہ اتنی باتیں کہ . . . .

"اے اتنی عمر ہو گئی ہے اب تک بیٹی کو گھر بٹھا رکھا ہے"۔

کون ماں اور کون باپ اپنی بیٹی کو اپنے گھر بٹھا رکھنا چاہتا ہے بلکہ جس گھر میں جس دن بیٹی پیدا ہوتی ہے اسی دن ہی سے تو اس کی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جس دن کسی غریب ماں کے گھر کوئی بیٹی پیدا ہوتی ہے اس دن کے بعد وہ غریب ماں اپنا عروسی جوڑا پھر کبھی نہیں پہنتی۔ اپنا عروسی جوڑا اور اپنے جہیز کا سارا سامان اپنی بیٹی کے بیاہ کے دن کے لئے اٹھا رکھتی ہے۔

لیکن معاشرے کے بہت سے مرد لڑکی کے لئے نہیں بلکہ جہیز کے لئے آتے ہیں۔

ہمارا قانون اور ہمارا مذہب بھی ان ساری غیر انسانی رسوم کے خلاف ہے۔ ہمارے ملک میں پچھلی صوبائی اسمبلی نے جہیز اور مہر پر مکمل پابندی کا مسودہ قانون بھی منظور کیا تھا۔ لیکن جیسے ہی یہ پابندی عاید ہوئی "شادی کا کاروبار" اور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔

دولہوں کی بھی بلیک مارکیٹ شروع ہو گئی تھی۔ دولہا کا ظالم باپ دلہن کے مظلوم باپ سے نفرتیہ پوچھتا۔

"جہیز کے "دو ہاتھ" ہزار روپیہ تو منظور ہے۔ اب بولو "بلیک" میں کیا دو گے۔؟" (آزاد) "

آخر میں محترم کالم نگار نے یہ دعا مانگی ہے کہ جب تک ایسا معاشرہ قائم نہ ہو جس میں اس قسم کی انسانیت سوز رسومات ختم ہو جائیں ——

خدا کسی غریب کو بیٹی نہ دے۔

بیٹی دے تو پھر اسے جوانی نہ دے۔

جوانی دے تو پھر باپ کو غربی نہ دے۔

اور ہم اس دعا پر آمین بالجہر کہتے ہیں۔

لیکن صرف دعا اور اس پر آمین سے کیا ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ تو ہمیں خود قائم کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ یہاں قرآن مجید کا نظام رائج ہو جائے۔

—— (۰) ——

۲۔ قرآن کریم سے واقفیت

جماعتِ اسلامی کے ترجمان "ایشیا" کی ۷ر فروری کی اشاعت میں ایک خط شائع ہوا ہے جسے مکتوب نگار نے ایک زائرِ حرم کے ہاتھ مدینہ طیبہ بھیجا ہے کہ اسے لفظاً لفظاً روضۂ اقدس پر بیٹھ کر پڑھا جائے۔ اس خط کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

> السلام علیک یا رسول اللہ!
>
> قرآن پاک میں آتا ہے کہ جو شخص آپ سے سچی محبت رکھتا ہو اور اس محبت اور اطاعت کے واسطے سے خدا کے حضور میں دعا مانگے خصوصاً ایامِ حج میں، اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

ہم مکتوب نگار سے تو نہیں (کہ ہمیں اس کے مبلغِ علم کا پتہ ہے) مدیر ایشیا سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن پاک میں کس مقام پر یہ آیا ہے۔

یہ ہے ان حضرات کی قرآنِ مجید کے متعلق علم کی کیفیت —— اور اس کے بعد ان کے دعاوی!

—— (۰) ——

۳۔ ایک ذہنیت

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ انہیں لاکھ سمجھائیے وہ کبھی اپنی غلطی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ حتیٰ کہ ان کی ایسی ایسی حماقتیں جن پر ساری دنیا ہنسے ان کے سامنے ہوں گی لیکن کیا مجال جو وہ اس کا اعتراف کر لیں کہ ان سے غلطی ہوئی ہے۔ نہ وہ اسے تسلیم کریں گے نہ ان کے معتقدین۔ کیا قرآن مجید میں اس قسم کی ذہنیت کا ذکر آیا ہے؟

طلوعِ اسلام:- جی ہاں! اس کا ذکر بڑی شد و مد سے آیا ہے اور اس لئے اسے ابلیسیت کہہ کر پکارا ہے۔ ابلیس پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے لیکن وہ کبھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ آدم سے بھی لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی — جب آدم پر اس کی غلطی واضح ہوئی تو اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور عرض کیا کہ — ربنا ظلمنا انفسنا — اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے۔ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھل گیا۔ ابلیس سے پوچھا گیا تو اس نے پوری رعونت سے کہا کہ میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ نہ ہی میں نے غلطی کی ہے — وہ راندۂ درگاہ

ہوگیا۔ ابلیس اگر ایک دفعہ بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرے تو دنیا بھر کی لعنتوں سے بچ جائے۔ لیکن اس کی رعونت، اس کی انانیت، اسے اس طرف آنے نہیں دیتی۔ وہ دنیا بھر کی لعنتیں برداشت کر لیتا ہے (کیونکہ ان کے لئے وہ خود فریبانہ توجیہات وضع کر لیتا ہے) لیکن غلطی کے اعتراف کی "سبکی" برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ ہے وہ ذہنیت جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔

---- (۰) ----

۴۔ دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں

یہی صاحب ایک اور بات بھی پوچھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان اتنے عجز و الحاح سے خدا سے دعائیں مانگتے ہیں۔ تنہا بھی۔ جمعہ اور عیدین کے اجتماعات میں بھی۔ حتیٰ کہ خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر، اور عرفات کے میدان میں، لاکھوں کی تعداد میں۔ پھر بھی ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوع اسلام:۔ آپ نے غلط کہا کہ ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ قبول ہوتی ہے اور اس کا ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے یہ دعا ہر اجتماع میں سنی ہوگی کہ

اللّٰھم اخذل من خذل دین محمدؐ

اے اللہ! جو شخص (یا قوم) دینِ محمدؐ کو رسوا کرے، تو اسے ذلیل و رسوا کر دے

آپ سوچئے کہ ہم سے زیادہ "دینِ محمدؐ کو رسوا کرنے والا کون ہے۔ اقبالؒ نے تو مدت ہوئی کہا تھا کہ ---- امتی باعثِ رسوائی پیغمبرؐ ہیں ---- لہٰذا، خدا ہماری دعا کو سنتا ہے اور اسے قبول کر لیتا ہے۔ ہم صدیوں سے یہ دعا مانگتے چلے آرہے ہیں اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِہٖ (۳/۱۵۹) اگر وہ تمہیں ذلیل و رسوا کر دے تو دنیا میں کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے!

لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ اس دعا کے بعد ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ولا تجعلنا منھم۔ ہمارا شمار ان میں نہ کیجئے۔ یعنی اور لوگ اگر دینِ محمدؐ کو رسوا کریں تو انہیں تو ضرور ذلیل و رسوا کیجئے۔ لیکن ہمارے ساتھ یہ کچھ نہ کیجئے۔ کیوں صاحب! ہمارے ساتھ یہ کچھ کیوں نہ ہو؟ کیا ہم (یہودیوں کے زعمِ باطل کے مطابق) خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔ خدا کی کوئی چہیتی اولاد نہیں۔ اس کے قانونِ مکافات میں کسی کی تخصیص نہیں ہوتی۔

آپ کسی کے سامنے اسلام کے اصول پیش کیجئے۔ وہ ان کی حقانیت کو تسلیم کرے گا لیکن اس کے بعد وہ کہے گا کہ اگر اس تعلیم کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں کو ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں عطا کرتا ہے، تو پھر مسلمان دنیا میں ذلیل و خوار کیوں ہیں ---- اور اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اور وہ منہ پھیر کر چل دے گا ---- یہ

ہماری زبوں حالی ہے جو دنیا کو اسلام کی طرف آنے نہیں دیتی۔ اسلام کے راستے میں ہم حائل ہیں۔ اگر ہم اسلام کے نام لیواؤں کی حیثیت سے دنیا کے سامنے نہ ہوں اور اقوامِ عالم، اس کے اصولوں کو (ON MERIT) پرکھیں تو وہ آج اسلام قبول کر لیں، یا کم از کم اسے حقارت کی نگاہ سے کبھی نہ دیکھیں۔ یوں ہم اسلام کی رسوائی کا موجب بنتے ہیں اور ہماری یہ دعائیں قبول ہوتی ہیں کہ

بارالہا! جو تیرے دین کو رسوا کرے، تو اسے رسوا کر دے۔

(باقی)

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(در سلسلہ فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۱ء)

حسبِ ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔

۱۔ محترم حیات احمد صدیقی صاحب۔	نیچ گاؤں ڈھاکہ	۲۵/۸۱	۹۔ محترم محمد حنیف صاحب۔	رائے ونڈ	۲۵/-
۲۔ ،، غلام شبیر خان ڈاہا صاحب۔	اولڈ خانیوال	۴۰۰/-	۱۰۔ ،، ڈاکٹر مظفر حمید خان صاحب۔	،،	۲۵/-
۳۔ ،، عبدالرشید صاحب۔	لاہور	۱۰۰/-	۱۱۔ ،، محمد دین صاحب	،،	۳۰/-
۴۔ ،، کرم الٰہی صاحب	ڈھاب بٹری (جہلم)	۵/-	۱۲۔ ،، فیض رسول صاحب	،،	۲۵/-
۵۔ ،، ظہور الدین بھٹی صاحب۔	لاہور	۵/-	۱۳۔ ،، غلام کبریا صاحب	،،	۲۰/-
۶۔ ،، محمد شریف میر صاحب	لاہور	۵/-	۱۴۔ محترمہ خالدہ سرور صاحبہ	،،	۴۰/-
۷۔ ،، راجہ عبدالعزیز خان صاحب۔	دھیر کوٹ (آزاد کشمیر)	۱۰/-	۱۵۔ محترم ڈاکٹر ایم باقر رضوی صاحب۔	،،	۲۵/-
۸۔ میسرز عزیز جنرل سٹور۔	کرشن نگر۔ لاہور	۵/-	۱۶۔ رائے ونڈ کے ایک محترم دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔		۳۰/-

نوٹ:- قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔آر۔او نمبر ۲۵/(R)/۴۵ مورخہ ۲۲/۸/۴۵ء مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I مورخہ ۳/۹/۴۵ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵/۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)، لاہور

زیادہ منافع حاصل کیجئے

اپنی رقم

قومی بچت کی اسکیموں میں لگائیے

ڈیفنس سیونگ سرٹیفیکیٹ

یہ اپنی نوعیت کی واحد سرمایہ کاری ہے جس میں آپ
کی رقم ملک سے بہت زیادہ یقینی طور پر
سب سے بڑا منافع حاصل کرتی ہے۔
جس پر انکم ٹیکس بالکل معاف ہے
۱۰ فیصد سالانہ شرح منافع کے علاوہ
ان سرٹیفیکیٹ کی خریداری میں
لگائی ہوئی رقم پر بھی انکم ٹیکس
بالکل معاف ہے۔

پوسٹل لائف انشورنس

پوسٹل لائف انشورنس، ملک میں زندگی
کے بیمہ کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ حکومت
کے زیر انتظام، اس کا تمام
منافع پالیسی ہولڈروں میں
تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی پریمیم کی
شرح دوسری انشورنس کمپنیوں کے
مقابلے میں بہت کم ہے اور بونس
گزشتہ سب سے زیادہ ہے

انعامی بانڈ

بچت کی بچت، انعام کا انعام

صرف دس روپے کے ساتھ ساتھ ہر تین ماہ بعد
نقد انعامات حاصل کرنے کے
مواقع فراہم کرتا ہے۔ پانچ روپے
کے انعامی بانڈ پر دس ہزار روپے
کے انعامات کے ۱۲ موقعے ملتے ہیں
اسی طرح انعامی بانڈ اسکیم میں ہر سہ ماہی
ملک کے ۱۲ شہروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔

پوسٹ آفس سیونگ بینک

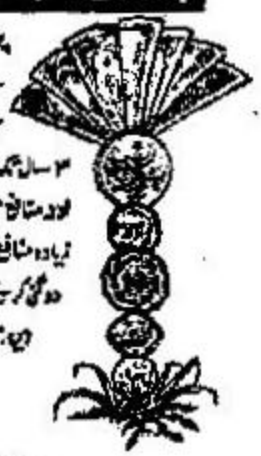

پوسٹ آفس سیونگ بینک میں
سب سے زیادہ منافع ملتا ہے۔
سیونگ اکاؤنٹ پر ½ ۵ فیصد
۳ سال تک کے میعادی کھاتوں پر ۶ فیصد
اور منافع مع بونس سکیم میں ۷ فیصد سے
زیادہ منافع ملتا ہے۔ آپ سات سال سے پہلے رقم
واپس لے سکتے ہیں اور کسی وقت بھی نکلوا سکتے
ہیں۔ تمام رقم پر انکم ٹیکس بالکل معاف ہے۔

جاری کردہ: سنٹرل ڈائریکٹوریٹ آف نیشنل سیونگز۔ اسلام آباد

ORIENT